مُنشی نولِ کشور

اور

ان کے خطّاط و خوشنویس

از

امیر حسن نورانی

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

منشی نول کشور

اور

ان کے خطاط و خوشنویس

مُنشی نوَل کِشور

اور

ان کے خطاط و خوشنویس

از

امیر حسن نورانی

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

* Munshi Naval Kishore Aur Unkey Khattat Va Khush Naves
By. Amir Hasan Norani.

سنہ اشاعت۔ اپریل، جون — 1994 شک 1916

© ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

پہلا اڈیشن: 3000

قیمت: =/13

سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو 650

ناشر: ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی-110066

طابع: جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی 110006

پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے ترقی اردو بیورو (بورڈ) قایم کیا گیا۔ اردو کے لیے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو دو دہائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعے سرگرم عمل ہے اس ادارہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستیں، تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترقی اردو بیورو نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے۔ کیوں کہ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں۔ اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقا کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اہمیت مسلّم ہے۔ بیورو کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلوپیڈیا ذولسانی اور اردو۔ اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ بیورو کی کتابوں کا معیار اعلیٰ پائے کا ہوتا ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کر رہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کرتے

ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانے سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہو سکیں۔

یہ کتاب بھی بیورو کے اشاعتی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے علمی ادبی ذوق کے تسکین کا باعث بنے گی اور آپ کی ضرورت کو پورا کرے گی۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو

فہرست عنوانات

گزارشِ احوالِ واقعی

باب اول — 19 تا 26

منشی نولکشور حالات وخدمات

ولادت، تعلیم وتربیت

اخبار کوہ نور لاہور سے متعلق

مطبع کا قیام ۱۸۵۸ء میں

اودھ اخبار کا اجراء نومبر ۱۸۵۸ء

مطبع کی ترقی اور خدمات

اخلاق وعادات

مختصر زندگی عظیم کارنامے

وفات ۱۸۹۵ء

باب دوم — 27 تا 39

فنِ خطاطی کا آغاز وارتقاء

خطاطی کیا ہے؟

فنِ تحریر کا آغاز

حروفِ تہجی کی ابتداء

عربی رسم الخط۔ نسخ

خطِ نسخ کا ارتقاء اور تاریخی جائزہ

خط نستعلیق : فارسی اردو رسم الخط
خط نستعلیق ہندوستان میں
باب سوم 41 تا 47
عہد مغلیہ میں خطاطی کی ترقی اور
نستعلیق نگاری کا ارتقار
دہلی کے ماہر خوشنویس
شیخ نور اللہ
حافظ نور اللہ
خلیفہ سلطان
شاہ اعز الدین
حافظ محمد علی
محمد حفیظ خان
میر محمد حسین خان
محمد جان
محمد یار
غلام محمد دہلوی
محمد امیر رضوی پنجہ کش
باب چہارم 48 تا 56
"خطاطی کا دوسرا بڑا مرکز لکھنؤ"
لکھنؤ کے ماہر خطاط
محمد اسلم
میر عطا حسین تحسین
سید اعجاز رقم خاں
حافظ نور اللہ
مرزا محمد علی

مقبول نبی خاں

سلطنت اودھ کا خاتمہ اور رخطاطی کا زوال

خوشنویسی اور کتابت میں فرق

مطبع کا قیام اور کتابت کا آغاز

110 تا 57

باب پنجم

مطبع نولکشور اور کتابت کا فروغ

مطبع کے ممتاز کاتب

منشی امیر اللہ تسلیم

منشی آل حسن

میر ابن حسن

محمد اسمٰعیل

منشی اشرف علی

منشی امیر علی نقاش

منشی افضل حسین

مولوی انوار احمد

منشی باقر علی ہمسر

منشی برج لال

پیارے لال کلاں

منشی تلک رام ہوش

منشی جلال شاہ

منشی چھیدی لال

منشی جمن لال

مرزا محمد جواد

منشی حامد علی مرصع رقم

میر حشمت علی

زائر حرم، حمید لکھنوی

خیراتی لال شگفتہ

منشی خلیل احمد

منشی دیبی پرشاد سحر

سیّد ریاض الحسن

منشی سرجو پرشاد

شرف علی شرف

منشی شیو پرشاد وہبی

منشی شمس الدین اعجاز رقم

منشی صفدر علی

منشی عباس علی

حافظ علی حسین

منشی عبد الرحیم

حافظ عبد الصمد

سید علی حسین

غلام محمد خان

فیاض حسین

منشی جعفر حسین

قاسم علی نقاش

منشی کالکا پرشاد

منشی گوبند پرشاد فضا

مولوی محبوب احمد

منشی مکھن لال

مرزا جان محمود

منشی مہتاب رائے عاصی

محمد علی عرف محمد بخش
مرزا مصطفےٰ حسین
منشی وزیر محمد
منشی واجد علی شریں رقم
مولوی ہادی علی اشک
منشی ہیرا لال
شیخ تاج الدین عشرت
ابوطاہر زیدی
ابوجعفر زیدی
قاری محمد علیم
قیصر مرزا
نجم الحسن
محمد نواب رمّال
کتابیات 111

بعون خالق کون و مکان و توفیق آفرینندۂ زمین و آسمان

کلیات آتش

…ا طبع نفیس مطبوع اہل جہان شد

کلیات آتش، مطبع لکھنؤ ۱۸۶۳ء

"گزارشِ احوالِ واقعی"

جس طرح شعر و سخن سامع نواز اور فردوسِ گوش ہے، اسی طرح خوشنویسی باصرہ نواز اور جنّتِ نگاہ ہے۔ دونوں فن اپنی زیبائی اور دل ربائی کے باعث علمی دنیا کی رونق اور ادبی محفلوں کی زینت کو دوبالا کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں دونوں فن معزز و مقبول ہیں۔ جس طرح شاعر اپنے تخلص سے ممتاز تھے، اسی طرح خوشنویس تحریر کے ساتھ اپنے نام کے آگے کاتب لکھتے تھے۔ بلند پایہ شعرا "ملک الشعراء" کا خطاب پاتے، تو خوشنویس "فخر الکتاب" کے لقب سے نوازے جاتے تھے۔ یہ علمی دنیا کی ستم ظریفی ہے کہ شاعروں کے تذکرے ہر دور میں مرتب کئے گئے، ان کے نام اور کلام کو زندہ رکھا گیا۔ لیکن خوشنویسوں کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہمارے پاس اس فن کے بلند پایہ فنکاروں کے حالات اور کارناموں سے واقف ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ فارسی میں قدیم خطاطوں کے چند تذکرے موجود ہیں، لیکن اردو میں چند نامکمل تذکروں کے سوا کچھ نہیں۔ ہندوستان میں فن خوشنویسی کے تین اہم مرکز تھے۔ حیدر آباد، دہلی، لکھنؤ[1]۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے آخری دور میں جب دہلی پر تباہی و بربادی کی گھٹا چھا گئی تو ہر فن کے ماہرین نے لکھنؤ کا رخ کیا جو اپنے عہدِ عروج میں قدم رکھ چکا تھا۔ دہلی کے ماہر خطاط لکھنؤ چلے گئے جہاں عام اہلِ علم کے علاوہ حکمراں طبقے نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تقریباً سو برس تک لکھنؤ کی محفلِ علم و ہنر کی رونق قائم رہی، اور ہر فن نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ معاشی خوشحالی اور فارغ البالی کے باعث عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں، زیب و زینت کا شوق عروج پر تھا۔ یہ حالت چشمِ فلک کی نظرِ بد نے پل بھر میں بدل دی۔ ۱۸۵۶ء میں آخری تاجدارِ اودھ تخت و تاج

---

[1] دراصل خوشنویسی اور خطاطی کے چار مرکز تھے۔ لاہور، حیدر آباد، دہلی، لکھنؤ۔ اول الذکر اب ہندوستان میں شامل نہیں ہے، اور ثانی الذکر کی تفصیلات پیشِ نظر نہیں اور نہ ہمارے موضوع میں شامل ہیں۔

سے محروم کردیئے گئے۔ اور اسی طرح سلطنتِ مغلیہ کے آخری فرمانروا کو انگریزوں نے تخت و تاج سے سبکدوش کردیا۔ اور ان کو جلاوطنی کی سزا دے کر برما کے پایۂ تخت رنگون پہنچادیا۔ واجد علی شاہ مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند کردیئے گئے۔ اتفاق سے دونوں اچھے خوشنویس اور خوش گو شاعر بھی تھے۔

۱۸۵۷ء سے قبل لکھنؤ خطاطوں اور خوشنویسوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ سلطنت اودھ کے زوال نے اس مرکز کو بھی زوال سے ہمکنار کردیا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں نظر آئے گی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اس فن کا احیاء اور ارتقا مطبع منشی نولکشور کا رہین منت ہے۔ جس نے مختصر عرصے میں اس کو حیاتِ نو بخشی۔

یہ مختصر تذکرہ ان خطاطوں، خوشنویسوں اور کاتبوں کے حالات پر مشتمل ہے جو مطبع نولکشور سے وابستہ تھے۔ اور جنہوں نے اس فن کو ترقی دینے میں بہت جد و جہد کی اور جنہوں نے اس فن کے حال اور مستقبل کو روشن کردیا۔ محسن علم و فن نولکشور نے اپنے مطبع میں ایک دار الکتابت قائم کیا۔ اس کے لئے شاہی دور کے کہنہ مشق اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔ جنہوں نے اس فن کا ذوق و شوق رکھنے والوں کی تربیت کی اور اس کی ترقی کے لئے محنت اور لگن سے کام کیا۔ اس دار الکتابت کی بدولت کاتبوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا۔ مطبع نولکشور میں کام کرنے والے کاتبوں کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وہ جو مطبع میں باقاعدہ ملازم تھے، دوسرے وہ جو مطبع سے مسودے لے کر خود اپنے گھر میں بیٹھ کر لکھتے تھے۔ مستقل کام کرنے والے کاتبوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی، جیسا کہ مطبع کے باقی ماندہ بعض رجسٹروں سے معلوم ہوا ہے غیر مستقل لکھنے والوں کی تعداد بھی سو سے کم نہ تھی۔ بعض زمانے میں اس سے زیادہ رہی ہے۔ اس کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ منشی نولکشور نے دیسی اور ولایتی ساخت کے تقریباً تین سو دستی لیتھو پریس فراہم کرتے تھے۔ جن میں سے نصف مطبع کے اندر نصب کرادیئے تھے اور باقی ان محنتی مستریوں کے حوالے کردیئے جو کام سے بخوبی واقف تھے۔ ان کو طباعت کے لئے مطبع سے کتابت کئے ہوئے مسودے دیئے جاتے تھے۔ ہر روز وہ جتنا کام کرتے تھے اس کا نصف معاوضہ نقد دیا جاتا اور نصف دستی پریس کی قیمت میں جمع کرلیا جاتا۔ جب قسطوں کے ذریعہ کل مقررہ قیمت ادا ہوجاتی تو وہ پریس اسی مستری کی ملکیت میں آجاتا۔ اب وہ آزادی سے اپنا کام کرتا تھا، اور اپنے پریس کا کوئی مناسب نام رکھ لیتا۔ لکھنؤ میں ایسے پریسوں کی تعداد بہت ہوگئی تھی، ان میں سے بعض نے بہت

ترقی وشہرت حاصل کی[1] منشی نولکشور کی اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر روز کاتب جتنا لکھ کر لاتے تھے وہ سب دستی پریسوں کو دے دیا جاتا جو دوسرے دن طبع ہو کر آجاتا۔ اس طرح پچاس جزو کی کتاب پچاس کاتبوں میں تقسیم کی جاتی تو دو دن میں کتابت مکمل ہو جاتی اور وہ پچاس جزو پچاس دستی پریسوں میں دے دیئے جاتے جو دوسرے روز چھپ کر آجاتے۔ اس طرح ایک بڑی کتاب چار پانچ یوم میں مکمل ہو جاتی تھی۔

مطبع نول کشور کے خطاطوں اور خوشنویسوں کا یہ مختصر تذکرہ میں نے ترقی اردو بیورو کی ڈائرکٹر۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی تحریک پر ترتیب دیا۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم صاحبہ کو اس فن سے خاص دلچسپی ہے۔ انھوں نے اپنی نگرانی میں ترقی اردو بیورو کی طرف سے کتابت وخوشنویسی کے تربیتی مراکز قایم کیے ہیں جہاں اس فن کی تربیت بحسن وخوبی انجام دی جارہی ہے اور اب کاتبوں کی قلت محسوس نہیں ہوتی۔ کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ حل ہوتا جارہا ہے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کی ہی نگرانی میں پہلی بار کتابت کورس میں باقاعدگی آئی اور دو سالہ نصاب تیار ہوا جس کے تحت ترقی اردو بیورو کے قایم کردہ مراکز میں باقاعدہ فن کتابت کی تربیت کا انتظام ہے۔ فن خوش نویسی اور خطاطی کی تاریخ میں نصاب تیار کروانے کا غالباً یہ پہلا موقعہ ہے۔ نصاب میں شامل بعض کتابوں کو بھی ترقی اردو بیورو سے شائع کروایا تاکہ فراہمی کا مسئلہ حل ہو جائے۔

کتاب کا کام شروع کرنے سے پہلے میں ان دشواریوں کا اندازہ نہ کر سکا۔ جو حالات معلوم کرنے کے سلسلہ میں پیش آئیں۔ خیال تھا کہ مطبع کے رجسٹروں اور دوسرے متعلقہ کاغذات سے کاتبوں کے حالات معلوم ہو جائیں گے۔ مگر سوا چند ناموں کے کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ کیونکہ ۱۹۵۷ء میں بعض ناسازگار حالات اور باہمی اختلافات کے باعث جب مطبع منشی نولکشور ۱۹۵۰ء میں

---

[1] اس سلسلہ میں لکھنؤ کے مشہور اصح المطابع کا نام لیا جاسکتا ہے جس کے مالک مولانا عبدالعلی آسی مدراسی پہلے مطبع نولکشور میں کام کرتے تھے۔ وہیں سے دستی پریس حاصل کر کے اپنا مطبع جاری کیا جس نے بعد میں ترقی کی اور شہرت حاصل کی۔ مولانا آسی کے دو بیٹے بہت مشہور ہوئے۔ شمس العلماء عبدالغنی صدر شعبہ فارسی ناگپور یونیورسٹی دوسرے مولانا عبدالقوی فاتی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی۔ دوسرے نامی پریس کے مالک خواجہ قطب الدین جن کا مطبع نامی بہت مشہور ہوا وہ بھی پہلے مطبع نولکشور میں کام کرتے تھے۔ ان کے ایک بیٹے شفاء الملک حکیم شمس الدین لکھنؤ کے ممتاز طبیب اور عالم تھے۔

دو حصوں پر تقسیم کیا گیا تو دفتر مطبع اور اودھ اخبار کے دفاتر کے جملہ کاغذات، فائلیں، سب لکھنؤ پیپر مل کو ردّی کے طور پر دے دیا۔ اس وقت کسی نے مالکان کو اس طرف توجہ نہ دلائی کہ اس ردّی میں علم و فن کا نادر و نایاب ذخیرہ بھی ہے جس کا ضائع ہونا علمی دنیا کے لئے سانحۂ عظیم ہوگا۔ بہرحال یہ انہونی ہو کر رہی۔ حسن اتفاق سے کچھ کاغذات اور رجسٹر کسی طرح محفوظ رہ گئے۔ جن سے کچھ معلومات حاصل کی جا سکیں۔

اردو میں خوشنویسوں کے تذکرے لکھے ہی نہیں گئے۔ صرف ایک تذکرہ صحیفۂ خوشنویسان شاغل بجے پوری نے مرتب کیا جو کافی ضخیم ہے لیکن اس میں اودھ اور نولکشور کے خطاطوں پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ صرف چند نام شامل ہیں، حالات نہ ہونے کے برابر۔ انہوں نے مولوی غلام محمد کے فارسی تذکرہ کے ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔ اور اس کے بعد راجستھان کے خوشنویسوں پر زیادہ توجہ کی ہے۔ مجموعی طور پر یہ ناموں کی کھتونی بن گئی ہے۔ مجھے اس بات کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ نولکشور سے وابستہ کاتبوں کے حالات تلاش کرنے میں کتنی دشواری ہوگی۔ منشی شمس الدین اعجاز رقم جیسے باکمال کے حالات کسی نے ۲ سطروں سے زیادہ نہیں لکھے تو اوروں کا کیا ذکر۔ مجھے مطبع نولکشور کے رجسٹر احکامات و ہدایات ملازمان بابت سنہ ۱۸۸۹-۹۰ء کے دیکھنے کا موقع ملا، جن کی مدد سے میں نے کاتبوں کے ناموں کی فہرست بنائی۔ اس کے بعد ان کے حالات معلوم کرنے اور خط کے نمونے حاصل کرنے کی جد و جہد شروع کی۔ اس سلسلہ میں کئی ماہ لکھنؤ کے مختلف گلی کوچوں میں گردش کرتا رہا۔ جو کچھ مستند طریقہ پر معلوم کر سکا اسی کو ضبط تحریر میں لایا۔ بعض اخلاف نے اپنے اسلاف کے کارناموں کو نمایاں کرنے کی مخالفت کی اور حالات بتانے سے انکار کر دیا۔ اور کسی قسم کا تعاون نہیں کیا۔ نہ ان قطعات اور تحریروں کے فوٹو اسٹیٹ دیئے جو ان کے پاس بطور یادگار محفوظ ہیں۔ لیکن بعض لوگوں نے جو کچھ معلوم تھا اس کو بتانے میں کوئی عذر نہیں کیا۔ چند ایسے افراد بھی ملے جو اب بھی اپنے اجداد کی پیروی میں اس فن سے وابستہ ہیں۔ اور اس کو عزت و فخر کے ساتھ سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی تو حاصل نہ ہو سکی۔ تاہم جتنا کچھ ہو گیا وہ معتبر و مستند ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ لکھنؤ کے تمام مشہور و ماہر خطاطوں میں اکثریت ان لکھنے والوں کی ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مولوی ہادی علی۔ اور منشی شمس الدین اعجاز رقم کے سلسلۂ تلامذہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تذکرہ میں چند ان ماہرینِ فن کا ذکر بھی شامل کر دیا ہے جو موجودہ دور

میں اس فن کی خدمت کر رہے ہیں اور ان کا تعلق بھی اعجاز رقم کے سلسلہ سے ہے۔

کتاب کے آغاز میں منشی نولکشور کی مختصر سوانح حیات شامل ہے۔ اس کے بعد فنِ تحریر کی تاریخ پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ پس منظر کے طور پر دہلی اور لکھنؤ کے ممتاز خطاطوں کا مختصر حال بھی شامل کیا گیا ہے۔ جن کی جد و جہد سے اس فن نے ترقی کی۔ مطبع نولکشور کے جن خطاطوں کے حالات لکھے گئے ہیں سب کی تحریروں کے نمونے شامل نہیں کئے جا سکے عام طور پر اس زمانے میں کاتب کسی کتاب کے خاتمہ پر اپنا نام درج نہیں کرتے تھے۔ جن کے متعلق تصدیق ہو سکی ان کی تحریروں کی نقل شامل کی گئی ہے۔ محض اساتذہ کے نایاب قطعات اور وصلیوں کی تصاویر حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اعجاز رقم کے چند قطعات کے فوٹو اسٹیٹ ایک علمی ادارے سے ملے جو شامل کتاب ہیں۔ مطبع نولکشور سے وابستہ متعدد خطاط، ترک سکونت کر کے دوسرے مقامات پر سکونت پذیر ہو گئے تھے ان کے متعلق معلومات فراہم کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن مکمل حالات کی تلاش کی جد و جہد جاری رکھی جائے گی تاکہ اودھ اور لکھنؤ کے خطاطوں کا ایک مکمل تذکرہ مرتب کیا جا سکے۔

سید امیر حسن نورانی

یکم فروری ۱۹۸۹ء لکھنؤ

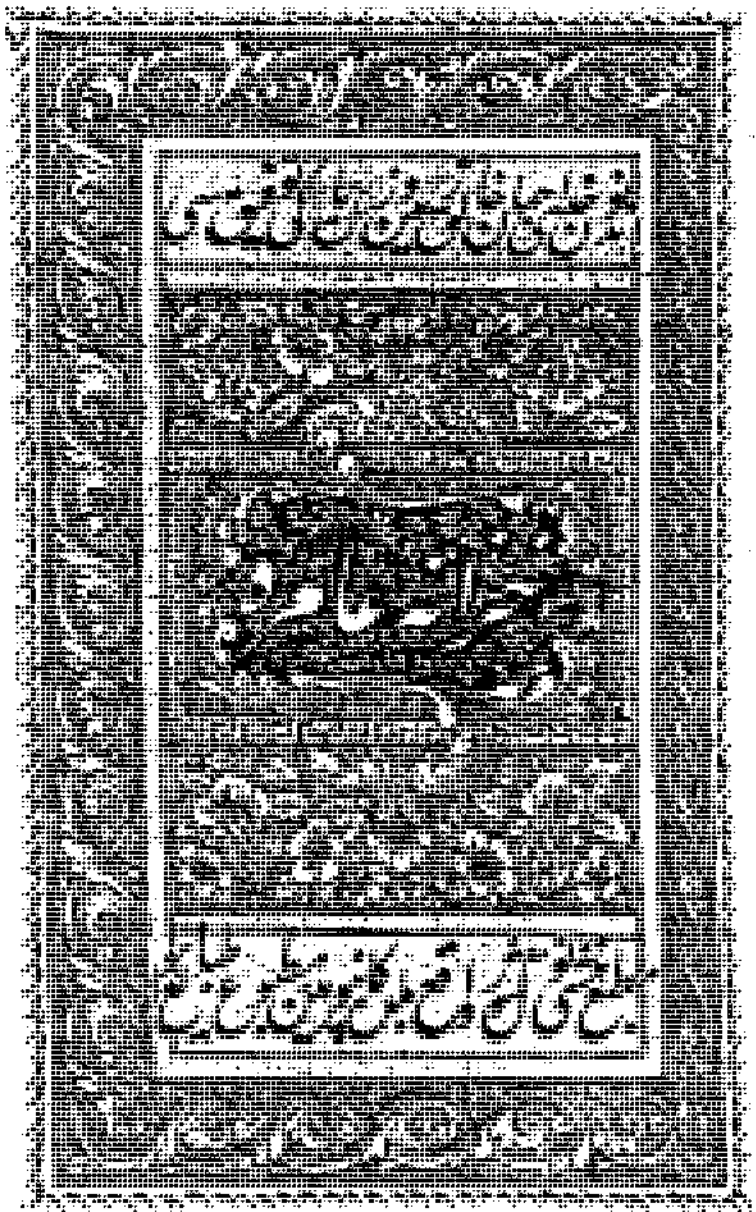

خزانہ عامرہ از غلام علی آزاد بلگرامی

--

مطبع کانپور ستمبر ۱۸۷۱ء

بابِ اوّل

منشی نولکشور، مختصر حالات و خدمات

محسنِ علم و ادب منشی نولکشور کی ولادت ۱۸۳۶ء کو رہیٹر نامی گاؤں میں ہوئی، جو ضلع متھرا (یو پی) میں واقع ہے۔ ان کے والد بابو جمنا پرشاد بھارگو قصبہ ساسنی ضلع علی گڑھ کے خوشحال زمیندار تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے۔ ایک نولکشور سے بڑے اور تین چھوٹے تھے۔ ان کے دادا منشی بال مکند انگریزی عہد میں آگرہ کے مہتمم محافظ خانہ تھے۔ نولکشور نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے آبائی وطن ساسنی میں پائی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ان کی تعلیم مکتب میں ہوئی جہاں انہوں نے فارسی درسیات کی متداول کتابیں پڑھیں۔ عربی زبان بھی سیکھی۔ وہ تحصیل علم کے شائق تھے۔ ذہانت خداداد تھی۔ دس سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم مکمل کرلی۔ ثانوی تعلیم کے لئے آگرہ کالج میں داخلہ لیا اور پانچ سال تک بہت محنت اور لگن سے تحصیل علم میں مصروف رہے۔ کتابوں کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اسی زمانے میں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا تو لکھنے کی مشق شروع کردی۔ مختصر عرصے میں ان کے مضامین "سفیرِ آگرہ" میں شائع ہونے لگے یہ شمالی ہندوستان کا مشہور اخبار تھا۔ نولکشور کے مضامین پسند کئے گئے۔ حکومت نے حوصلہ افزائی کی۔ اور وظیفہ مقرر کردیا۔ رفتہ رفتہ ان کا رجحان صحافت کی طرف بڑھتا گیا۔ کچھ عرصہ بعد کالج سے تعلیم کا سلسلہ منقطع کرلیا، اور مضمون نگاری اور مطالعہ کتب پر وقت صرف کرنے لگے۔ اردو زبان و ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ سترہ سال کی عمر میں ان کی شہرت ہونے لگی۔

اخبار کوہ نور سے تعلق اور لاہور میں قیام: جب بحیثیت مضمون نگار نولکشور کو شہرت حاصل ہوئی تو کوہ نور اخبار لاہور کے ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے نے نولکشور کو اپنے اخبار میں کام کرنے کی دعوت دی۔ شوقِ صحافت نگاری کی تکمیل کی خاطر نولکشور نے یہ دعوت قبول کرلی اور لاہور چلے گئے اور کوہ نور کے انتظامی عملے میں شامل ہوگئے۔ ان کو ابتدا میں دس روپیہ ماہوار ملنے لگا۔ نولکشور نے اخبار اور مطبع کا کاروبار بڑی محنت سے چلایا۔ منشی ہرسکھ کو ان پر بہت اعتماد تھا

ایک بار وہ کسی مضمون کے سبب سے معتوب ہوئے تو ان کو قید کی سزا ہو گئی۔ ان کی عدم موجودگی میں اخبار اور مطبع کا سارا کام سنبھال لیا۔ اور ہر سکھ رائے کو رہائی دلانے کی جدو جہد کرنے لگے، جس میں ان کو کامیابی ہوئی۔ ان کے اس کردار سے عوام و خواص کی نظروں میں ان کی عزت و وقعت بڑھ گئی اور ہر سکھ لال بہت خوش و مطمئن ہوئے۔ چار سال نولکشور لاہور میں رہے۔ ان کی عمر کا اکیسواں[۲۱] سال تھا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی شروع ہوئی جس نے ہندوستانیوں اور انگریزی اقتدار کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سارے ملک میں جہالت اور افلاس کا دور دورہ تھا۔ اخلاقی قدریں دم توڑ رہی تھیں۔ اور ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی، جس میں مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات نمایاں تھے۔ منشی نولکشور حالات کو گہری نظر سے دیکھتے رہے۔ ملک کے حالات سے وہ بہت متاثر تھے۔ ان کے دل میں ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ موجزن تھا۔ بحیثیت صحافی انہوں نے طے کیا کہ اپنا اخبار جاری کریں۔ اس لئے کو وہ نور کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ اور اپنا اخبار اور مطبع قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے ختم ہوئے تو وہ لاہور سے آگرہ گئے۔ ان کو اپنے منصوبہ پہ عمل کرنے کے لئے آگرہ کی فضا سازگار نظر نہ آئی تو لکھنؤ کا رخ کیا۔ جو صدیوں سے علوم و فنون کا گہوارہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں نے اس تہذیبی مرکز کو بھی تباہ و برباد کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس شہر کے آغوش میں مشرقی تہذیب اور علم و فن کا چراغ ابھی گل نہیں ہوا تھا۔ منشی نولکشور کی دوربین نگاہوں نے اس شہر کی اہمیت کا اندازہ کر لیا اور اپنے منصوبے کے لئے لکھنؤ کا انتخاب کیا۔

مطبع کا قیام ۱۸۵۸ء

منشی نولکشور ۱۸۵۸ء کے اوائل میں لکھنؤ پہنچے۔ اور آغا میر کی ڈیوڑھی میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر حاصل کیا۔ ایک ہینڈ پریس اور چند پتھر خرید کر مطبع قائم کیا۔ کچھ عرصہ بعد محلہ رکاب گنج میں راجہ مان سنگھ کی کوٹھی میں مناسب جگہ حاصل کر لی اور اس میں طباعت کا کام کرنے لگے۔ سرمایہ کی کمی کے باعث انہوں نے چند ہینڈ پریس حاصل کیے اور انہیں پر کام کا آغاز کیا۔ اس وقت تک لیتھو پریس کی مشینیں دستیاب نہ تھیں۔ نہ ان کے پاس اتنا سرمایہ تھا کہ مشین خرید سکتے۔ انہوں نے لاہور کے تجربات سے فائدہ اٹھایا، اور چھوٹی چھوٹی مذہبی

کتابیں اور بچوں کے لئے قاعدے وغیرہ طبع کرنے لگے جو کچھ چھاپتے تھے وہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا۔ کچھ عرصہ بعد سرکاری دفاتر سے بھی کچھ کام ملنے لگا۔ پریس پر کھڑے رہ کر خود بھی کام کرتے صرف ایک یا دو ملازموں کی مدد حاصل کر سکے۔ جو کچھ چھاپتے خود فرمائش کرنے والوں تک پہنچاتے تھے۔ ان کی محنت اور معاملات کی صفائی کے پیش نظر سرکاری حکام نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کو طباعت کے لئے زیادہ کام ملنے لگا۔ عوام ان سے خوش تھے کہ بچوں کے لئے ابتدائی کتابیں ارزاں قیمت پر ملنے لگیں۔ اس طرح ان کے کاروبار میں ترقی کی رفتار تیز ہو گئی۔

اودھ اخبار کا اجراء

منشی نولکشور کا اولین مقصد یہ تھا کہ وہ اپنا اخبار جاری کریں اور اس کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت کریں۔ انہوں نے چار سال لاہور میں صحافت کے شوق کی تکمیل کے لئے گزارے تھے۔ مطبع کے قیام کے چند ماہ بعد ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو اودھ اخبار کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ جو چار صفحات پر مشتمل تھا۔ اخبار کا نام بھی نہایت مناسب، دلکش اور تاریخی پس منظر کی رعایت سے رکھا۔ جو انکی ذہانت کا بیّن ثبوت ہے۔ وہ خود ایک تجربہ کار صحافی تھے۔ اپنے اخبار کو انہوں نے صحافت نگاری کے صحیح اصولوں پر چلایا۔ جس کی بدولت وہ تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اودھ اخبار کے نامہ نگار مختلف صوبوں میں مقرر کرنے کا انتظام کیا تاکہ ہر جگہ کی خبریں بروقت ملتی رہیں۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے تمام بڑے شہروں میں اودھ اخبار کے نامہ نگار اور سفیر مقرر ہو گئے۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ صوبوں اور ریاستوں کی راجدھانی میں حکومت کے نمائندے رہتے ہیں یا نولکشور کے۔"[1]

منشی نولکشور نے اودھ اخبار کی ترقی اور اس کو مقبول عام بنانے کے لئے اپنے دور کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کیں، وہ بڑے مردم شناس آدمی تھے۔ ان کی کوششوں سے بہت سے گمنام اہلِ علم اردو زبان و ادب کو ترقی دینے کے لئے میدان میں آئے۔ ان میں بعض اتنے مشہور و مقبول ہوئے کہ آج علمی ادبی دنیا کو ان پر فخر ہے۔

[1] اردو کے ہندی ادیب از ناظر کاکوروی مطبوعہ انوار بکڈپو لکھنؤ۔

مطبع کی ترقی اور خدمات

لکھنؤ، جو مشرقی تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور علوم و فنون کا سرچشمہ تھا، انتزاعِ سلطنت اودھ کے بعد اجڑنے لگا تھا۔ مگر ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک آزادی کے بعد تو اس پر تباہی و بربادی کے بادل منڈلانے لگے۔ علماء و فضلاء نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے، ادیبوں اور شاعروں کے قدردان ختم ہو گئے۔ علم و دانش کی مشعلیں حوادث روزگار کے تھپیڑوں سے بجھنے لگیں۔ اہل علم و فنکار لکھنؤ چھوڑ کر ملک کے مختلف علاقوں میں منتشر ہونے لگے۔ بڑے بڑے کتب خانے تباہ و برباد ہو گئے۔ جو ذخیرے محفوظ رہ گئے وہ کوڑیوں کے مول فروخت ہونے لگے۔ اس پر آشوب دور میں منشی نولکشور نے اپنا مطبع قائم کیا تھا۔ ابتدا میں انہوں نے مذہبی کتابیں زیادہ شائع کیں جن کی ہر شخص کو ضرورت تھی۔ پہلے قرآن شریف کی طباعت پر توجہ کی، جس میں ان کو بہت کامیابی اور نیک نامی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد بھاگوت گیتا، رامائن اور بعض دوسری کتابیں اردو میں شائع کیں کیونکہ اس زمانے میں اکثر ہندو اردو ہی زیادہ پڑھتے تھے۔ بعض کتابیں اردو ہندی دونوں میں شائع کیں۔ ان مطبوعات کی زیادہ سے زیادہ فروخت کے باعث ان کے کاروبار کو ترقی ہوئی۔

اس کے بعد منشی نولکشور نے ان نادر و کمیاب مخطوطات کو فراہم کرنے کی کوشش شروع کی جو انگریزوں کی دست برد سے محفوظ رہ گئے تھے۔ لکھنؤ کے علاوہ ملک کے دوسرے مقامات پر بھی اپنے نمائندے بھیجے تاکہ جہاں کوئی اہم مخطوطہ ملے اسے حاصل کر لیں۔ اس کام کے لئے کافی سرمایہ صرف کیا۔ دوسرا اہم کام یہ انجام دیا کہ ان علماء، فضلاء اور ادیبوں کو اپنے مطبع میں کام کرنے کی دعوت دی جو ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں بے سرو ساماں ہوئے۔ اور معاشی بحران کی شدت نے ان کو فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کوشش میں بھی ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اور کئی ماہر و باکمال عالم، متعدد ادیب و انشاء پرداز ان کے مطبع سے وابستہ ہو گئے۔ نولکشور نے قدیم مسودات کی صحت اور ان پر مفید حواشی لکھنے کا کام ان کے سپرد کیا۔ اس طرح اپنے مطبع میں شعبۂ تصنیف و ترجمہ اور صحت کتب قائم کر دیا۔ اس شعبہ میں جو کام مکمل ہوتا اس کو دارالکتابت کے سپرد کر دیا جاتا تھا جہاں ماہر فن خطاط ان کی کتابت کرتے۔ ہر شعبہ کا ایک مہتمم مقرر تھا، اور خود منشی نولکشور سب کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔

مطبع کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ قرآن شریف کی کتابت کرنے والے کاتبوں کو باوضو رہنے کی ہدایت تھی۔ اسی طرح پریس کے مستری اور ان کے تحت کام کرنے والوں کے لئے قرآن کی طباعت کے وقت پاک صاف اور باوضو رہنے کی تاکید کی جاتی تھی۔ ویسے عام طور پر سب ہی مذہبی کتب کا احترام پیش نظر رہتا تھا۔ ناظر کاکوری نے لکھا ہے کہ

> "لکھنؤ میں جس قدر مشہور حافظ، عالم، مؤرخ، ادیب اور شاعر اس مطبع میں بیک وقت جمع ہوگئے تھے ہندوستان کے کسی دوسرے مطبع کو نصیب نہ ہوئے"[1]

منشی نولکشور نے جن علماء و فضلاء اور دیگر فنکاروں کی خدمات حاصل کیں ان میں سے ہر ایک کے علمی و فنی مرتبے کے لحاظ سے ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ ان کو فکر معاش سے آزاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ یکسوئی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہیں۔

اخلاق و عادات، مذہب مسلک

منشی نولکشور بہت خوش اخلاق، نیک دل، بامروّت اور بلند ہمت آدمی تھے۔ بحیثیت انسان بلند نظر اور مذہبی تعصّب و تنگ نظری سے بہت دور تھے۔ وہ خود ہندو تھے، لیکن تمام مذاہب کا پورا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے ہر مذہب کی مذہبی کتابیں شائع کیں۔ اپنے زمانے کے حالات اور تجارتی نقطہ نظر سے اسلامی علوم و فنون پر زیادہ توجہ کی۔ سب سے زیادہ کتابیں اردو زبان میں طبع کرائیں۔ اردو زبان و ادب کی جتنی خدمت انہوں نے کی، کوئی ادارہ بھی نہ کر سکا۔ انہوں نے خود اردو میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اردو میں لکھتے پڑھتے تھے۔ انہوں نے اودھ اخبار بھی اردو میں نکالا۔ عربی، فارسی اور سنسکرت سے کئی سو بڑی کتابوں کے اردو میں ترجمے کرائے۔ اردو میں داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا جیسی طویل داستانیں لکھوا کر طبع کرائیں جو چالیس پچاس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں، اتنا بڑا ذخیرۂ داستان ہندوستان کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں میں ملنا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے مطبع اور اخبار سے متعلق سارا دفتری کاروبار اردو میں رکھا۔ دفتری کاغذات، فائلوں اور رجسٹروں کے لئے نئی اصطلاحات وضع کیں۔

---

[1] اردو کے ہندو ادیب، مطبوعہ انوار بکڈپو لکھنؤ۔

منشی نولکشور نے اپنے عہد کی ممتاز علمی اور سیاسی شخصیتوں سے خوشگوار تعلقات قائم کئے اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کیا۔ سرسید احمد خان، مرزا غالب نواب سالار جنگ، راجہ محمود آباد، مہاراجہ پٹیالہ اور جے پور ان کے مداح اور ان کی خدمات کے معترف تھے۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے بانی ممبران میں تھے اور پہلے اجلاس میں شریک تھے۔ منشی نولکشور کی شہرت ملک کے علاوہ دوسرے ممالک میں پھیل گئی۔ ان کے مطبع کی عربی و فارسی کتابیں ایران، افغانستان اور چینی ترکستان تک جاتی تھیں، ان ممالک کے تاجرانِ کتب خریداری کے لئے لکھنؤ آنے لگے۔ انگلینڈ، فرانس اور مصر و عرب میں بھی ان کو شہرت حاصل ہوئی۔ امیر افغانستان اور شاہ ایران نے ان کی خدمات کو سراہا۔ انگریزی حکومت نے ان کو سی۔ اے۔ آئی کے خطاب سے نوازا۔

جب منشی نولکشور کی مالی حالت مستحکم ہوگئی تو انہوں نے اپنی آمدنی کا بڑا حصہ تعلیمی اداروں اور طالب علموں، غریبوں اور دوسرے حاجت مندوں میں بڑی فراخ دلی سے تقسیم کیا۔ محمڈن کالج علی گڑھ، آگرہ کالج، جبلی کالج لکھنؤ اور بہت سے دوسرے اداروں کو گرانقدر امداد دی۔ اور اپنی تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ بطور عطیہ پیش کیا۔ خیراتی اداروں کی دل کھول کر امداد کی۔ لکھنؤ کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی رونق دوبالا کی۔

مختصر زندگی، عظیم کارنامے

منشی نولکشور نے ۱۸۵۸ء کے اوائل میں مطبع قائم کیا۔ ماہ نومبر میں اودھ اخبار جاری کیا اور ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء میں وفات پائی۔ ان کو صرف ۳۶ سال کام کرنے کا موقع ملا۔ اس مختصر مدت میں انہوں نے طباعت و اشاعت کے ساتھ ساتھ دوسری متعلقہ صنعتوں کو اس وقت فروغ دیا جب صنعت و حرفت جمود و تعطل کا شکار تھی۔ اور انہوں نے علم و فن کی جو مشعل روشن کی وہ آج بھی ہماری علمی و ادبی محفلوں اور اداروں کو منوّر کر رہی ہے۔ وہ سچے محبّ وطن اور علم دوست انسان تھے۔ ایک کامیاب ناشر اور تاجر کتب کی حیثیت سے بھی کامیاب تھے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے فن صحافت کا معیار بلند کیا۔ ملک کی سیاسی خدمات میں پیش پیش رہے۔ وہ ایک سچّے محبِّ وطن تھے اور ان کا اودھ اخبار ملک کے اتحاد اور سالمیت کا حامی اور سماجی خدمات کا ترجمان تھا۔ سرسیّد احمد خاں کی تحریکوں کا حامی تھا۔ انہوں نے قومی یک جہتی کے لئے بڑی محنت سے ۱۸۶۶ء میں ملیہ تہذیب کے نام سے ایک انجمن قائم کرائی

جس میں لکھنؤ کے ممتاز لوگ شامل تھے۔ منشی نولکشور اس کے روح رواں تھے۔ اس کے ہفتہ وار جلسوں میں شریک ہوتے اور تقریر کرتے تھے۔

منشی نولکشور کو ملک میں اور خاص طور پر علمی دنیا میں بہت ہر دل عزیزی نصیب ہوئی۔ ہر مذہب اور قوم کے لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کی مدح میں شعراء نے طول طویل قصائد اور نظمیں لکھی ہیں۔ مرزا غالب نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ

"خدا نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت دی ہے گویا بجائے خود قران السعدین ہیں" (اردوئے معلّٰی)

منشی نولکشور نے جو شہرت اور عزت حاصل کی وہ ان کی خدمات کے مقابلے میں کم ہے۔ ان کی زندگی آئندہ نسلوں کے لئے نمونۂ عمل تھی۔ وہ ایک اوسط درجے کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے حصے میں کوئی بڑی خاندانی جائداد نہیں آئی۔ معمولی رقم سے کاروبار شروع کیا۔ دیانت داری اور انتھک محنت نے کاروبار کو ترقی دی۔ ان کی وفات کے وقت ڈاکٹر سکسینہ مصنف تاریخ ادب اردو کے بقول انہوں نے ایک کروڑ کی جائداد چھوڑی۔ ان کے مطبع کی شاخیں کانپور۔ لاہور۔ پٹیالہ۔ الٰہ آباد۔ اجمیر شریف جبل پور میں قائم ہوگئی تھیں اور ایجنسیاں دہلی۔ پٹنہ۔ کلکتہ وغیرہ میں تھیں۔ لندن میں ان کا نمائندہ موجود تھا۔

منشی نولکشور حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت میں بھی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کا معیاری نمونہ تھے۔

وفات

منشی نولکشور نے ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء میں اچانک وفات پائی۔ وہ نہایت تندرست تھے۔ وفات سے قبل بظاہر کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوئے۔ فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے روح نے جسد خاکی کو الوداع کہا۔ اس وقت ان کی عمر انسٹھ سال تھی۔ ان کا جسد خاکی آخری رسوم کے لئے ایک طویل اسپیشل ٹرین سے کانپور لے جایا گیا۔ آخری رسوم ان کے متبنّٰی بیٹے پراگ نرائن کے ہاتھوں انجام پائیں۔

کلیات صائب ستمبر ۱۸۷۵ء

باب دوم

فنِ خطّاطی کا آغاز اور عہد بعہد ارتقاء

خطّاطی کیا ہے؟ خطّاطی، کتابت اور تحریر تینوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہ انسان کے افکار اور خیالات کو حروف یا تصاویر کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ان آوازوں کی صورتوں اور خاص نشانات کے لئے استعمال ہوتے ہیں، جن کو انسان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے استعمال کرتا ہے۔ جس طرح آوازوں میں فرق ہوتا ہے، اسی طرح آوازوں کے نشانات بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان کو حروف کہا جاتا ہے۔ زمین پر انسانی آبادی کے آغاز سے انسان نے اپنی ضرورت کے مطابق بامعنی آوازوں کو باقی رکھنے کے لئے نشانات بنانے کی کوشش شروع کر دی تھی، علّامہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ

> "الفاظ ہوا کی مدد سے منہ کے اندر سے نکلتے ہیں، اور ہوا کے ساتھ ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ چونکہ تمدّنی اور معاشرتی زندگی میں انسان کے باہمی تعلقات کی وسعت ضروری ہے۔ اس لئے اس بات کی حاجت ہوئی کہ جو لفظ منہ سے نکلے وہ قائم رہے اور ضرورت کے وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جا سکے۔ یا ایک زمانے سے دوسرے زمانے تک قائم رہے، اس غرض کو پورا کرنے کے لئے کہ جو تمدنی زندگی سے پیدا ہوئی، نقوش ایجاد ہوئے۔ تاکہ ان آوازوں کی قائم مقامی کریں جو بصورت حروف منہ سے ہوا کے ذریعے نکلتے ہیں اسی کو کتابت کہتے ہیں جن کے اصول و ضوابط کو رسم خط کہا جاتا ہے۔ ہر نقش جس حروف کی قائم مقامی کرتا ہے اسی کیفیت کو لئے ہوئے ہوتا ہے جو اس حروف کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ وہ نقش اسی آواز کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی قائم مقامی

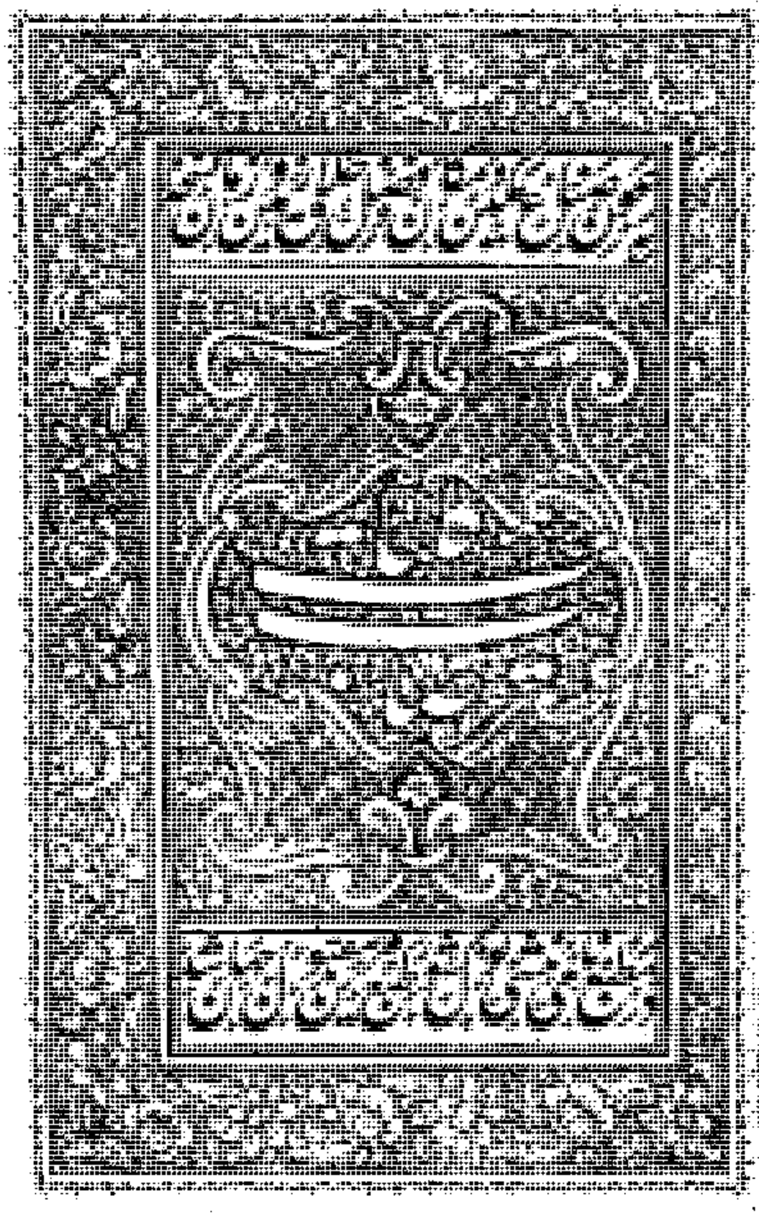

کلیات صائب ستمبر ۱۸۷۵ء

باب دوم

فنِ خطّاطی کا آغاز اور عہد بعہد ارتقار

خطّاطی کیا ہے؟ خطّاطی، کتابت اور تحریر تینوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہ انسان کے افکار اور خیالات کو حروف یا تصاویر کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ان آوازوں کی صورتوں اور خاص نشانات کے لئے استعمال ہوتے ہیں، جن کو نسان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے استعمال کرتا ہے۔ جس طرح آوازوں میں فرق ہوتا ہے، اسی طرح آوازوں کے نشانات بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان کو حروف کہا جاتا ہے۔ زمین پر انسانی آبادی کے آغاز سے انسان نے اپنی ضرورت کے مطابق بامعنی آوازوں و باقی رکھنے کے لئے نشانات بنانے کی کوشش شروع کر دی تھی، علّامہ ابن خلدون نے نی تاریخ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ

> "الفاظ ہوا کی مدد سے منہ کے اندر سے نکلتے ہیں، اور ہوا کے ساتھ ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ چونکہ تمدّنی اور معاشرتی زندگی میں انسان کے باہمی تعلقات کی وسعت ضروری ہے۔ اس لئے اس بات کی حاجت ہوئی کہ جو لفظ منہ سے نکلے وہ قائم رہے اور ضرورت کے وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جاسکے۔ یا ایک زمانے سے دوسرے زمانے تک قائم رہے، اس غرض کو پورا کرنے کے لئے کہ جو تمدنی زندگی سے پیدا ہوئی، نقوش ایجاد ہوئے۔ تاکہ ان آوازوں کی قائم مقامی کریں جو بصورت حروف منہ سے ہوا کے ذریعے نکلتے ہیں اسی کو کتابت کہتے ہیں جس کے اصول و ضوابط کو رسم خط کہا جاتا ہے۔ ہر نقش جس حروف کی قائم مقامی کرتا ہے اسی کیفیت کو لئے ہوئے ہوتا ہے جو اس حروف کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ وہ نقش اسی آواز کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی قائم مقامی

کرتا ہے جس کو اہلِ زبان اپنے مخصوص لہجے اور صوتی کیفیت میں تلفظ (مخصوص مخارج سے) سے ادا کرتا ہے۔ اسی کتابت سے انسان تمدن کے درجۂ تکمیل کو پہنچا[1]

مشہور اور ممتاز عالم علامہ شمس الدین اکفانی نے لکھا ہے کہ

"کتابت اور تحریر کے ذریعہ نوع انسانی کا امتیازی خاصہ قوت سے فعل میں ظاہر ہوتا ہے' اور اسی کے ذریعہ وہ دوسرے حیوانوں سے ممتاز ہوتا ہے"[2]

زمانۂ قدیم میں فنِ تحریر کا آغاز تصاویر کے ذریعہ ہوا۔ جیسا کہ جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے۔ ہر آواز کے لئے ایک مخصوص چیز کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ وسط ایشیا' شمالی افریقہ اور ہندوستان (بشمول پاکستان) میں ایسی چٹانیں اور مجسمے ملے ہیں جن پر نقوش اور تصاویر موجود ہیں۔ بحرِ روم اور اس کے اطراف سے جنوبی ہندوستان تک زمانۂ قدیم کی ایسی تختیاں اور ظروف ملے ہیں' جن پر تصویری خطوط موجود ہیں۔ فنِ تحریر کے متعلق مذہبی روایات بھی ہیں' مگر ان میں بہت اختلافات ہیں۔ یہاں ان کا تجزیہ کرنا بے محل معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم دانشوروں اور علمائے سلف کے علاوہ مسلم مؤرخین نے فنِ تحریر کی تاریخ اور اس کی اہمیت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور اس کے ہر گوشے پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔

فنِ تحریر کا آغاز و ارتقاء

فنِ تحریر کے آغاز اور ارتقاء کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک تصویرٹری دور' دوسرا حروف کی صورتوں کا دور اور تیسرا حروف کی تشکیل کا دور۔ پہلے دور میں انسانی ابتدائی منزل میں تھا' اس وقت لکھنے کی ضرورت اور اس کا مواد کم ہوگا۔ کیونکہ پتھروں' چٹانوں' لکڑیوں اور پتوں وغیرہ پر لکھنا بہت محنت طلب ہوتا تھا۔ جیسے جیسے انسانی تمدن نے ترقی کی منازل طے کیں' اس فن کو بھی ترقی ہوئی۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ انسانی وجود کے آغاز کے بعد عرصہ تک تحریر کی ضرورت

---

[1] ترجمہ اردو مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ الہ آباد۔

[2] جلد دوم صفحہ ۸ مطبوعہ مصر

محسوس نہ ہوئی ہو۔ لیکن جب اجتماعی تنظیم کی ہیئت میں وسعت پیدا ہوئی اور اس کی ضرورتوں میں اضافہ ہوا تو اسے ایسے ذرائع کی تلاش کا احساس ہوا ہوگا جن کی مدد سے اپنے خیالات کو دور دراز رہنے والے لوگوں تک پہنچا سکے۔ اور اپنے ذہن و فکر کے نتائج کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر سکے۔

مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ تصویری خط کا آغاز قدیم مصر سے ہوا۔ وہاں کے بالغ نظر لوگوں نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ نقوش اور اشکال کو بنایا۔ جن کو وہ پتھر کی سلوں پر نقش کرتے تھے۔ بعض مؤرخین اور محققوں کا خیال ہے کہ حضرت مسیح سے پانچ ہزار سال قبل مصریوں نے رسم خط ایجاد کیا۔ مصر دنیا کا وہ قدیم ملک ہے جس کی تہذیب و تمدن کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ حضرت مسیح سے ۳۳۲ سال قبل سکندر اعظم نے مصر فتح کیا تھا۔ اس وقت وہاں کے بادشاہوں کے بنائے ہوئے اہراموں، میناروں اور محلوں پر تصویری خطوط موجود تھے۔ یونانی ان کو مقدس خیال کرنے لگے، اور ان کو ہیروغلافیکا (یعنی مقدس نقش) کا نام دیا۔ یہی لفظ بعد میں معرّب ہو کر ہیروغلافی ہو گیا۔ مصر کے قدیم تصویری خط کا یہی نام ہے۔ یہ تصویری رسم الخط تیسری صدی عیسوی تک رائج رہا۔ اس خط میں سات سو تصویروں سے کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً روح کے لئے چراغ، طاقت کے لئے کلہاڑی، ہوا کے لئے بادبان۔ انصاف کے لئے شتر مرغ کے پر کی تصاویر بنائی جاتی تھیں۔ اس رسم الخط میں عرصہ کے بعد کچھ ردّ و بدل ہوئے اور نام بھی تبدیل ہوتے رہے۔ ہیروغلافی کو آسان بنایا گیا تو ایک نیا خط بن گیا جس کو ہیراطیقی کہا گیا۔ یہ خط پہلے اوپر سے نیچے لکھا جاتا تھا، پھر دائیں سے بائیں لکھنے لگے۔ اس خط میں بھی کچھ دنوں بعد اختصار کی کوشش کی گئی تو ایک اور خط بن گیا جس کا نام دیموطیقی رکھا گیا۔ یہ خط مصر کے یونانی حکمرانوں میں بہت مقبول رہا۔

اسی زمانے میں ایران سے لے کر ایشیا کوچک تک ایک اور رسم الخط بھی رائج تھا جس کو میخی اور پیکانی کہا جاتا تھا۔ اس خط کے حروف کیل اور تیر کے پھل سے مشابہہ ہوتے تھے۔ قدیم ایران کے کھنڈرات میں یہ خط اب تک موجود ہے۔ اس خط کا سراغ تین ہزار سال قبل مسیح سے ملتا ہے۔ میخی اور ہیروغلافی خطوں کو قدیم تر سمجھا جاتا رہا۔ لیکن کچھ عرصہ قبل ہمارے زمانے میں سمیری قوم کے کتبات عراق میں دستیاب ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوا کہ اس قوم نے حضرت مسیح سے چار پانچ سال قبل سمیری خط ایجاد کیا تھا۔ یہ قوم عراق کے جنوبی

حصہ میں آباد تھی۔ یہ خط تصاویر اور نقوش پر مشتمل ہے۔ پہلے اس کے لئے دو ہزار نشانات تھے جو بعد میں گھٹ کر آٹھ سو رہ گئے تھے۔ اس میں بعض سے ظاہری مفہوم لیا جاتا اور بعض سے مجازی معنی لئے جاتے تھے۔ مثلاً سورج کی تصویر سے دن مراد لیا جاتا۔ بادشاہ کے لئے آدمی اور تاج کی تصویر بناتے تھے۔

عراق، ایران اور مصر کی طرح وادی سندھ میں بھی تصویری خط رائج تھا، جیسا کہ موہن جوداڑو اور ہڑپا سے برآمد ہونے والی تختیوں سے معلوم ہوتا ہے۔ چین کا رسم الخط بھی تصویری ہے جس کو ترمیم و تنسیخ کے بعد اہلِ چین نے برقرار رکھا ہے۔ وہی موجودہ زمانہ میں بھی رائج ہے۔ دنیا بھر میں عام طور پر تصویری خط رائج تھے، یورپ کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ اور علم الالسنہ نے ان رسم الخطوں کے سلسلہ میں بہت جدوجہد کی ہے اور ان کا ذوق و شوقِ تحقیق مسلسل جاری ہے۔

حروفِ تہجی کی ابتداء

تصویری خطوں کے بعد حروفِ تہجی کا رواج شروع ہوا۔ اس کی ایجاد کا سہرا ساری قوم کے سر بندھا۔ دنیا کے موجودہ عام رسم الخطوں کا ماخذ سامی حروفِ تہجی ہیں۔ سامی خط، شام، فلسطین اور دیگر عرب ممالک میں پہلے رائج ہوا تھا۔ اس کی بنیاد بھی قدیم تصویری خطوط کی مدد سے پڑی تھی۔ اس رسم الخط نے کئی منزلیں طے کر کے ایک ترقی یافتہ صورت اختیار کر لی تھی۔ اس رسم الخط کے بعد فنیقی اور آرامی خط وجود میں آئے۔ دوسری صدی قبل مسیح قبطی قوم نے آرامی رسم الخط اختیار کر لیا تھا۔ یہ قوم شمالی عرب، مشرقی اردن میں آباد تھی اور خانہ بدوشوں جیسی زندگی بسر کرتی تھی۔ نبطیوں نے اپنی ضرورت کے مطابق آرامی رسم الخط میں تبدیلیاں کیں اور ایک نیا طرزِ خط بنا لیا جس کا نام نبطی رسم الخط رکھا۔ اس زبان کے کتبات اور سکے موجود ہیں۔ عربوں نے تیسری صدی عیسوی میں نبطی خط اختیار کر لیا تھا۔ اور پانچویں صدی تک برابر اسی کو اپنی زبان کے لئے استعمال کرتے رہے۔ اس دوران حسب ضرورت اس میں ردّو بدل کر کے انفرادیت پیدا کر لی، اور ایک ایسا خط ایجاد کر لیا جو عربی زبان کے لئے مخصوص ہو گیا، یہی خط نسخ کہلایا۔ بعض عرب مؤرخین نے لکھا ہے کہ خط نسخ خط کوفی سے ماخوذ ہے۔ لیکن جدید تحقیق نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ دراصل خط کوفی بعض دوسرے خطوط کی طرح خط نبطی سے پیدا ہوا ہے۔ اور نسخ کے ساتھ یہ بھی عربی زبان کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ عرب میں خط کوفی سے پہلے عربی زبان کے لئے

خط معقلی رائج تھا۔ اس روایت کو گزشتہ دور کے ان مصنفین نے پیشِ نظر رکھا ہے جنہوں نے فنِ تحریر یا خوشنویسی کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ قرائن سے صرف نام کا فرق معلوم ہوتا ہے یقین ہے کہ عربی خط نسخ جو خط کوفی کے ساتھ استعمال ہوتا چلا آیا تھا اسی کا دوسرا نام معقلی ہوگا۔ ان دو کے علاوہ عربی کے لئے کسی تیسرے رسم الخط کا پتہ نہیں چلتا۔ خطوں میں عام طور سے دور اور سطح کا فرق ہوتا ہے۔ سطح سے مراد کشش ہے اور دور کا مطلب دائرہ۔ خط نسخ میں سطح تھی اور خط کوفی میں چھٹا حصہ دور ہوتا تھا۔ جیسا کہ ان خطوں کے حروف سے معلوم ہوتا ہے۔

عربی رسم الخط ظہورِ اسلام سے قبل عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا اسی لئے خطِ نسخ اور خط کوفی نے معمولی ترقی کی تھی، لیکن جب عرب میں اسلام پھیلا تو لکھنے پڑھنے کی ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا۔ اور روز بروز اس کی طرف توجہ بڑھتی گئی۔ اس کی بدولت دونوں رسم الخط ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مادری زبان عربی تھی، قرآن شریف بھی عربی میں نازل ہوا تھا۔ تحصیل علم اسلامی تعلیم کا ایک اہم جزو قرار پایا۔ ہر علم وفن کی ترویج کے لئے تحریر وکتابت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے آنحضرت نے لکھنا سیکھنے کی تاکید کی اور فرمایا کہ **قیدو العلم بالکتابۃ**۔ یعنی علم کو تحریر کے ذریعہ قید کرو" اور یہ بھی فرمایا کہ **اِنَّ مِن حَقَّ الْوَلَدِ علی والِدِہٖ اَن یعلمہ الکتابۃ**۔ یعنی باپ پر اس کے بیٹے کا یہ حق ہے کہ اس کو لکھنا سکھائے۔ آپ کے اس ارشاد کا اثر یہ ہوا کہ لکھنے کا رواج بڑھنے لگا۔ جب جنگ بدر میں مسلمانوں کو قریش پر فتح حاصل ہوئی تو ستر قیدی ہاتھ آئے۔ ان میں جو جاہل تھے ان کو فدیہ سے آزاد کر دیا گیا۔ اور جو قیدی لکھنا جانتے تھے ان کے لئے حکم ہوا کہ ہر قیدی مدینہ منورہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے تو اسکو بغیر فدیہ کے آزاد کر دیا جائے گا۔ اس طرح مسلمانوں میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور یہ سلسلہ بڑھنے لگا۔ جب اسلام عرب سے باہر پھیلنے لگا تو عربی رسم الخط بھی آگے بڑھنے لگا۔ اس وقت خط نسخ نقطوں اور اعراب (زیر، زبر، پیش) سے خالی تھا۔ اس لئے غیر عرب صحت کے ساتھ قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ۵۰ھ میں ابوالاسود نامی ایک دانشور نے اعراب ایجاد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کا شاگرد تھا۔ اس کا ایجاد کردہ اعراب نقطوں کی شکل میں تھا۔ تاہم اس سے کچھ آسانی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے بعد عرصے تک یہ صورت حال قائم رہی۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت میں عراق کے گورنر حجاج بن یوسف ثقفی کو حکم دیا گیا

کہ عربی رسم الخط میں اور اصلاح کی کوشش کرے۔ حجاج نے اس کام کے لئے ایک ماہر فن نصر بن عاصم کو مقرر کیا۔ انہوں نے نقطے وضع کئے اور قاعدہ بنایا کہ منقوط حروف پر سیاہ نقطے بنائے جائیں۔ اس سے رسم الخط کچھ اور آسان ہوگیا۔ چالیس سال یہ حالت قائم رہی۔ اس کے بعد اس میں دیگر اصلاحات کی کوشش جاری رہی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلے عربی حروف کی ابتدائی ترتیب اس طرح تھی۔

ا۔ ب۔ ج۔ د۔ ہ۔ و۔ ز۔ ح۔ ط۔ ی۔ ک۔ ل۔ م۔ ن۔ س۔ ع۔ ف۔ ص۔ ق
ر۔ ش۔ ت۔ ث۔ خ۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ غ۔

ان میں آخری چھ حروف عربوں نے ابتدائی دور میں بڑھائے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے خط نسخ میں صرف بائیس حروف استعمال ہوتے تھے۔ یہ ترتیب ابجد کہلاتی ہے۔ حروف کے اعداد سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ترتیب پسندیدہ ہے۔ یہ ترتیب حروف کی صورت کے اعتبار سے ہے۔ اور یہ تعلیم اور کتابت میں زیادہ مفید ثابت ہوئی۔

خطِ نسخ و نستعلیق کا تاریخی جائزہ

خط نسخ کا ارتقاء (عربی رسم الخط) عربی رسم الخط دائیں سے بائیں جانب لکھا جاتا ہے۔ دنیا کے قدیم رسم الخطوں میں چند ایسے خط تھے جو دائیں سے بائیں لکھے جاتے ہیں اور کچھ بائیں سے دائیں۔ بعض اوپر سے نیچے لکھے جاتے ہیں۔ چینی خط اوپر سے نیچے لکھا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں چینیوں کا اعتقاد تھا کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر موجود ہے۔ اس لئے ہر کام اوپر کی طرف سے شروع کرنا چاہیئے۔ یورپ کے لوگ بائیں سے دائیں لکھتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی زمانۂ قدیم سے یہ خیال قائم ہے کہ جسم میں خون کا دوران قلب کے ذریعہ ہوتا ہے' اور قلب بائیں جانب ہے اور وہی فہم و فراست اور عقل و فکر کا مرکز ہے۔ اس لئے تحریر بھی بائیں سے دائیں ہونا چاہیئے۔ عرب اور سامی دائیں سے بائیں لکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ فطری طور پر ہر کام دائیں جانب

سے شروع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انسان پہلے دائیں پیر کو اٹھا کر چلتا ہے اور پھر بائیں کو اٹھاتا ہے۔

بہرحال اعتقاد یا خیال جو کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ رومن اور ناگری رسم الخط جو بائیں سے لکھے جاتے ہیں وہ حروف کی ہیئت کے اعتبار سے بہت مناسب ہیں اور آسان بھی ہیں۔ اسی طرح عربی زبان کے لئے دائیں سے بائیں لکھنا اچھا اور آسان ہے۔ عربی حروف کا ایک راس ہے اور ایک عقب۔ راس' دائیں جانب پڑتا ہے اور عقب بائیں طرف۔ چند حروف کے راس اوپر اور عقب نیچے ہیں' اور کتابت حروف راس سے شروع ہوتی ہے جو دائیں طرف ہے' پھر اس کو عقب سے ملاتے ہیں جو بائیں طرف ہے' اور یہ طریقہ نطق کے مطابق ہے۔ اور پڑھنے میں آسان ہے۔ وہ حروف یہ ہیں۔

ا۔ ج۔ ح۔ خ۔ ع۔ غ

خط نسخ میں ایسا لوچ اور کشش تھی کہ بہت کم عرصے میں اس خط نے ترقی کی' اور اس سے متعدد خوشنما طرز تحریر رونما ہوئے۔ اس طرح یہ خط دلکش نقوش کی بدولت زیبائش کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ لوگ آرائش کے لئے عربی زبان کے الفاظ اور جملے اپنے لباسوں اور ہتھیاروں پر لکھواتے اور کندہ کراتے تھے۔ خلافت عباسیہ کے عہد میں نسخ کو بہت ترقی ہوئی۔ عباسی خلفاء نے اس طرف خاص توجہ کی۔ خلیفہ مہدی کے زمانے میں مشہور عالم خلیل بن احمد نے نقطے والے اعراب کے بجائے چھوٹی لکیروں والے اعراب کی علامتیں بنائیں (زیر۔ زبر۔ پیش) جو آج بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں اس فن کے ماہر اور خلیفہ کے استاد علی بن حمزہ کسائی (متوفی ۱۸۹ ہجری) نے اس رسم الخط میں کچھ اور اصلاحیں کیں' اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

اسلامی علوم و فنون کا سارا ذخیرہ عربی زبان میں تھا' قرآن اور احادیث نبوی اسی زبان میں ہیں۔ اس وقت مسلمان دنیا کے دور دراز ممالک تک پہنچ چکے تھے' وہ جہاں جہاں گئے وہاں عربی زبان اور اس کا رسم الخط (نسخ) بھی ساتھ گیا۔ اس زمانے میں عربی کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا رسم الخط نہ تھا جو اپنے وطن سے نکل کر دنیا کے دوسرے ممالک تک پہنچا ہو اور وہاں اپنے لئے جگہ بنائی ہو۔ عام طور پر مسلمانوں کے دلوں میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ وہ اپنی مقدس کتاب قرآن مجید کو دنیا کے سامنے دلکش انداز اور پرکشش پیرایہ میں

پیش کریں، اور اس کے لئے حسن آفرینی کا طبعی ملکہ بروئے کار لائیں۔ چونکہ اسلام میں مصوری کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، اس لئے مسلمان فنکاروں نے اپنی مہارتِ فن کو ظاہر کرنے کے لئے اور اس رسم الخط کی ترقی کے واسطے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بڑے جوش اور ایمانی جذبہ کے ساتھ صرف کیا اور خط میں زیادہ سے زیادہ حسن و دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خطاطی اور خوشنویسی ایک خوبصورت اور پاکیزہ فن بن گیا۔ اور اس کے بعد ایک عام فن کی حیثیت سے ترقی کرنے لگا، نوک پلک درست کرنے اور تراش خراش اور توازن کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔

خط نسخ کو اس وقت عروج حاصل ہوا جب سن ۳۲۰ھ میں ابن مقلہ نے باقاعدہ فن خطاطی کی بنیاد ڈالی اور اس خط کو خوشنما بنانے کے لئے چھ طرزِ تحریر اختراع کئے جن کے نام یہ ہیں۔

خطِ توقیع[2]۔ خطِ محقق[3]۔ خطِ ثلث[4]۔ خطِ نسخ[5]۔ خطِ رقاع[6]۔ خطِ ریحان[7]

خوشنویسی میں ابن مقلہ کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ وہ مختلف علوم میں ماہر ہونے کے علاوہ باکمال خوشنویس تھا۔ وہ اپنی غیر معمولی فہم و فراست کے باعث وزارت کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ مشہور مورخ، علامہ ابن خلکان نے تاریخ میں ابن مقلہ کے متعلق لکھا ہے کہ

كَانَ ابُو عَلي بن مقلَه اَوّلُ مَن نَقلَ هٰذِهِ الطّريقة مِنْ خطِّ الكُوفِين وَابرَزَها فِي هٰذِهِ الصُّورةِ وَلَه بِذَالِكَ فَضِيلَة والسبق وخطّه اَيضاً فِي نِهَايةِ الحُسنِ[1]

ترجمہ: ابوعلی بن مقلہ، پہلا شخص ہے جس نے خط کوفی سے عربی خط کو نکالا ہے اور اس کو اس انداز میں پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں اس کو شرف اولیت حاصل ہے۔ اس کا خط بھی بہت خوشنما اور دلکش تھا۔"

ابن مقلہ ماہ شوال سن ۲۷۲ھ میں پیدا ہوا، اور ماہ شوال ۳۲۸ھ بمطابق سن ۹۴۰ء میں خلیفہ مقتدر باللہ کے حکم سے قتل کیا گیا۔ اس کا بھائی ابوعبداللہ بھی ماہر خطاط تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے بعد ان کی اولاد نے اس فن کو ترقی دینے کی جد و جہد جاری رکھی۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے۔

---

[1] تاریخ ابن خلکان جلد اول صفحہ ۳۴۵، مطبوعہ قاہرہ مصر

خطِ نسخ کا دوسرا بڑا ماہرِ فن ابن بوّاب تھا جو ابن مقلہ کی وفات کے چوراسی سال بعد پیدا ہوا۔ نام ابوالحسن تھا۔ اس کا باپ امیر بویہ کا دربان تھا۔ اس نسبت سے وہ ابنِ بوّاب مشہور ہوا۔ ممتاز عالم و مؤرخ قلشقندی نے لکھا ہے کہ

"هُوَ الَّذِیْ اَکْمَلَ قَوَاعِدَ الْخَطِّ وَ تَمَّمَهَا وَ اِخْتَرَعَ غَالِبَ الْاَقْلَامِ الَّتِیْ اَسَّسَهَا ابْنُ مُقْلَه"[1]

ترجمہ: "ابن بوّاب نے خط اور خطّاطی کے قواعد کو مکمل کیا' اور اکثر خطوط کو مکمل کیا جن کی بنیاد ابنِ مقلہ نے ڈالی تھی"

ابن بوّاب نے ۴۱۳ھ ہجری میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا مشہور شاگرد یاقوت اس فن کا بلند پایہ استاد ہوا جس نے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ دراصل وہ ابن بوّاب کے شاگرد محمد بن عبد الملک کی ایک شاگردہ خاتون زینب شہدہ کا شاگرد تھا۔ اس طرح بالواسطہ اس کو ابن بوّاب کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ یاقوت کا نام خطّاطی کی تاریخ میں بہت نمایاں ہے۔ اسی کے نام پر مغلیہ عہد کے حکمران' باکمال خطّاطوں کو "یاقوت رقم" کا خطاب دیا کرتے تھے۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب الشفا مصنّفہ ابن سینا کو دیکھ کر محمد بن تغلق نے کتاب پیش کرنے والے کو دو لاکھ مثقال بطور انعام دیے تھے۔ یاقوت اپنے تمام پیش رو خطّاطوں پر سبقت لے گیا۔ وہ ایک خاص طرزِ خط کا موجد تھا۔ اس کے ہاتھوں خطِ نسخ اپنی اس شکل میں مکمل ہو گیا جو اب تک رائج ہے۔ یاقوت نے ۶۶۷ھ ہجری مطابق ۱۲۶۸ء میں وفات پائی۔

یاقوت نے خطّاطی و خوشنویسی کی ترقی اور فروغ کے لئے چھ ایسے ماہر شاگرد تیار کئے جنہوں نے اس کے بعد اس فن کو عروج تک پہنچانے کی کوشش کی' ان میں سے ہر ایک نے ماہرِ فن کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ خطِ نسخ ہر زمانے میں مقبول رہا اور ترقی کرتا رہا۔ عرب و عجم کے علاوہ ایشیا اور افریقہ کے بعض ممالک میں یہ رسم الخط رائج ہے۔ ماہرینِ فن اب تک اس کی مزید آرائش اور زیبائش میں معروف ہیں۔ اس کے چھ باکمال شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ مبارک شاہ قطب ۲۔ ناصرالدین مستطیب ۳۔ یوسف خراسانی ۴۔ ارغون کابلی ۵۔ میر حیدر کندہ نویس ۶۔ شیخ احمد سہروردی۔ ان باکمال شاگردوں

---

[1] صبح الاعشیٰ' جلد سوم۔ صفحہ ۱۷۔ مطبوعہ قاہرہ مصر۔

نے اس فن کو ترقی دینے اور پھیلانے میں پوری جدوجہد کی اور اختراعات بھی کی ہیں۔[1]

خطِ نستعلیق
فارسی، اردو رسم الخط

موجودہ فارسی زبان، ایران کی قدیم پہلوی زبان کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کا آغاز اور رواج اس وقت سے ہوا جب ایران پہ عربوں کا اقتدار قائم ہوا۔ قدیم ایران کا رسم الخط جو بھی رہا ہو، لیکن فارسی زبان کے لئے عربی رسم الخط استعمال کیا گیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ لکھنے کا عام رواج اسلامی دور کا رہینِ منّت ہیں۔ عرصہ دراز تک فارسی خط نسخ میں لکھی گئی۔ جب ایران میں طاہریہ خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو وہ علوم وفنون جو بغداد میں ترقی کر رہے تھے، ایران اور خراساں میں بھی پھلنے پھولنے لگے۔ اور بغداد کے اکثر اہلِ کمال ایران کا رخ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ دیلمی اور سلجوقی حکمرانوں کے زمانے میں ایران مرکزِ علم فن گیا۔ دیلمی حکمرانوں کے علمی وفنی ذوق وشوق کی بدولت آذربائیجان کا علاقہ علمی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اس علاقے میں پہلے پہل خط نسخ نے فنی وضع اختیار کی اور فن تحریر نے خطاطی کی حدوں سے آگے بڑھ کر نقاشی کے میدان میں قدم بڑھایا، اور اس خط میں مصوّرانہ نزاکتیں پیدا ہونے لگیں۔ ایرانیوں کے ذوق جمال اور ان کی نفاست پسندی نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ عربی کے خط نسخ میں ردو بدل کرکے کوئی نیا خوبصورت خط ایجاد کیا جائے۔ کیونکہ خطِ نسخ لکھنے میں قلم ہر لفظ اور حروف میں یکساں رہتا ہے۔ اس میں کجی اور ناہمواری تھی۔ گول دائرے نہیں بن سکتے تھے۔ ٹیڑھے چپٹے دائرے ایرانیوں کو بھدّے اور بدنما معلوم ہوتے تھے۔ نقاشی اور مصوّری کے شیدائیوں کو یہ ناموزونی اور ناہمواری ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس کو درست کرنے کی کوشش شروع کی۔ پہلے خطِ نسخ میں حروف کا آخری سرا ایک کیا گیا، دائروں میں گولائی پیدا کی گئی۔ اس طرح ایک نئے خط کی بنیاد استوار ہونے لگی۔ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں حسن بن علی فارسی نے توقیع اور رقاع کی آمیزش سے ایک نیا خط ایجاد کیا جس کا نام تعلیق رکھا گیا۔ یہ خط فارسی دفاتر کے لئے بہت موزوں ثابت ہوا۔ یہ شاہی دفاتر اور عام کاروباری مراسلات میں استعمال ہونے لگا۔ اس کو ترقی دینے والوں میں خواجہ تاج اصفہانی کا بڑا حصہ ہے۔

---

[1] پیدائش خط وخطاطان صفحہ ۲۴۱

آسان نویسی کے باعث یہ خط کئی ممالک میں رائج ہو گیا۔ خط تعلیق کی ایجاد کے بعد خطوں کی تعداد سات ہو گئی۔ مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ نے ایک قطعہ میں ان خطوں کا ذکر کیا ہے۔

کاتبان را ہفت خط باشد بطرز مختلف　　ثلث و ریحان و محقق و توقیع و رقاع
بعد ازاں تعلیق آن خط است کش اہل عجم　　از خطِ توقیع استنباط کردند اختراع

ایرانیوں نے تعلیق پر قناعت نہیں کی بلکہ اور بہتر اور خوبصورت خط کے اختراع کی جد و جہد جاری رکھی۔ یہاں تک کہ آٹھویں صدی ہجری میں امیر تیمور کے عہد میں میر علی تبریزی نے خط نسخ اور تعلیق کی آمیزش سے آٹھواں خط ایجاد کیا جو حسن و نفاست میں سابقہ خطوں سے زیادہ مقبول ہوا۔ اسی کا نام نستعلیق ہے۔ ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں اس بات سے اختلاف کیا ہے کہ نستعلیق کی ایجاد میر علی تبریزی نے کی، انہوں نے لکھا ہے کہ امیر تیمور سے قبل یہ خط وجود میں آچکا تھا۔ اگر ابو الفضل کی تحقیق کو درست تسلیم کیا جائے، تب بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تبریزی نے خطِ نستعلیق کو ترقی دینے میں بہت کوشش کی۔ اور اس کے شاگردوں نے اس کو ایران، ترکستان اور ہندوستان میں پھیلایا۔ نستعلیق کو خوبصورت اور دلکش بنانے میں میر علی کے بیٹے میر عبد اللہ تبریزی نے بہت محنت کی۔ اس کے بعد سلطان علی مشہدی نے اس کو مکمل کرنے کی جد و جہد کی اور وہ اس خط کا استاد کامل بن گیا۔ اس کے چھ شاگردوں نے بھی اس کو ترقی دینے کی کوشش جاری رکھی۔ سلطان علی نے اپنے پیش رو استاد میر علی تبریزی کی اس مہارت کا اعتراف کیا ہے جو اسے نسخ و نستعلیق دونوں میں حاصل تھی، کہتے ہیں

نسخ و نستعلیق گر خفی و جلی است　　واضع الاصل خواجہ میر علی است
وضع فرمود او ز ذہن دقیق　　از خط نسخ و ز خط نستعلیق

خطِ نستعلیق کے اصول و ضوابط خواجہ قمر الدین کے شاگرد رشید میر علی ہروی نے مرتب

لہ تذکرہ خوش نویساں کے مؤلف نے ثابت کیا ہے کہ نستعلیق امیر تیمور سے پہلے ایجاد ہو چکا تھا اور اس خط کو نظام الملک طوسی متوفی ۴۸۵ھ ہجری استعمال کرتے تھے۔ صفحہ ۷ تذکرہ خوشنویساں میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ سلطان محمود کے دفتر کا کام خط نستعلیق میں ہوتا تھا۔

گئے جو مشہور اور ماہر نستعلیق نگار تھے۔ ان کے بعد میر عماد حسین قزوینی نے اس خط کو مزید دلکش بنایا۔

خطِ نستعلیق ہندوستان میں

ہندوستان میں عہد اکبری سے کچھ عرصہ قبل خط نستعلیق رائج ہو چکا تھا۔ اس سے قبل نسخ کا رواج تھا۔ فنِ خطاطی کا رواج ہندوستان میں اس وقت سے ہوا جب مسلمان ہندوستان آئے۔ سلاطینِ دہلی کے زمانے میں خطاطی اور خوشنویسی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس سلطنت کا بانی محمد غوری ایک اچھا خوشنویس تھا۔ تذکرہ خوشنویساں کے مؤلف نے لکھا ہے کہ:

"معلک معزالدین محمد غوری بادشاہ بے ہنرمند، قدرشناس، خوشنویس قوی دست، زود نویس بود"

اس زمانے میں سرکاری دفاتر میں فرمان نویس اور محاسب گیری کی بہت اہمیت تھی اور اس کے لئے اچھے خوشنویس رکھے جاتے تھے۔ محمد غوری کے بعد قطب الدین ایبک تخت نشین ہوا، لیکن اس کو نوشت و خواند سے زیادہ دلچسپی نہ تھی نہ وہ بہت تعلیم یافتہ تھا۔ مگر اس کے جانشین التمش نے تعلیم کی طرف بہت توجہ کی۔ اور خود اپنے بچوں کو بھی دیگر علوم و فنون کے ساتھ خوشنویسی کی تعلیم بھی دلوائی۔ اس کا بیٹا ناصر الدین محمود، قرآن شریف کی کتابت کر کے اس کے معاوضہ سے اپنی ذاتی ضروریات پوری کرتا تھا۔ تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ:

"بادشاہ بے حلیم و کریم و متعبّد بود۔ و بیشتر نفقۂ خود از وجہ کتابت مصحف ساختے"[1]

التمش کے بعد بلبن حکمران ہوا تو اس نے بھی اپنے لڑکوں کو خطاطی اور خوشنویسی کی تعلیم دلوائی۔ اس کے چھوٹے بیٹے بغرا خان نے اپنے بیٹے کیقباد سے اپنی اور اپنے بھائی کی تعلیم کے متعلق کہا تھا کہ:

چوں من و برادرِ مہترِ من مفرداتِ لغت و نبشتن پیشِ خطاط تمام کردیم۔۔۔۔
پدر من فرمود کہ خطاطان را جامہ و انعام بدہند و معذرت کنند (تاریخ فیروز شاہی)[2]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، حالات ناصر الدین محمود [2] تاریخ فیروز شاہی

جب بادشاہ اور شاہزادے نے خطاطی اور خوش نویسی کی ضرورت اور اہمیت کے پیشِ نظر دوسرے علوم و فنون کی طرح ان کو ضروری سمجھتے تھے، تو عام لوگوں میں بھی اس کا ذوق و شوق بڑھنے لگا۔ کتابوں کی نقلیں کرانے اور عمارتوں کے کتبات کے لئے خوشنویسوں کی ضرورت مسلّم تھی۔ حکومت کی طرف سے ان کی خدمات گرانقدر معاوضے پر حاصل کی جاتی تھیں۔ خلجیوں کے دور میں اس فن پر کم توجہ کی گئی تھی۔ تغلقوں کے عہد میں خطاطی و خوشنویسی نے ترقی کی، خود محمد تغلق اچھا خوشنویس تھا۔ دورِ سلاطین کے آخر میں لودھی حکمرانوں کا دور دورہ ہوا۔ سکندر لودھی کا عہد علم و ادب کی ترقی کے لئے مشہور ہے۔ سکندر نے تمام سرکاری ملازمین کے لئے حکم جاری کیا تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ اس حکم کے باعث فن خطاطی و خوشنویسی کو بھی ترقی ہوئی۔ ملازمین میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ ان میں راجہ ٹوڈرمل بھی تھا جو بعد میں مغلیہ حکمران اکبر کے نورتنوں میں شامل ہو گیا تھا۔ مغلیہ سلطنت سے قبل خط نسخ کا رواج تھا، لیکن نستعلیق کا آغاز ہو چکا تھا۔

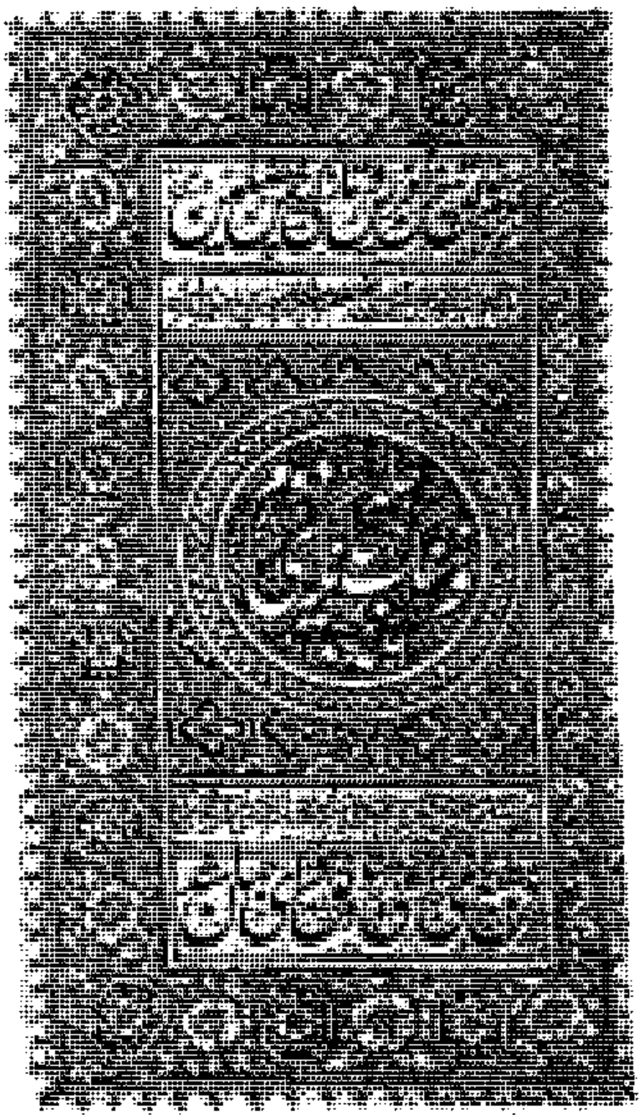

فرهنگ جهانگیری، جلد دوم

باب سوم

مغلیہ عہد میں خطاطی اور نستعلیق کی ترقی

ہندوستان میں خط نستعلیق کا آغاز

محققین کی رائے میں مغلیہ دور سے کچھ عرصہ پہلے ہوچکا تھا۔ لیکن اس کی ترقی و ترویج اسی عہد میں زیادہ ہوئی۔ سلطنت مغلیہ کا قیام ۹۳۲ء میں ہوا جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کر کے، ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دی تھی۔ مغلیہ سلطنت ۱۸۵۷ء تک قائم رہی تقریباً ساڑھے تین سو سال کے اس عرصہ میں فنونِ لطیفہ نے بہت ترقی کی۔ مغل اپنے ساتھ وسط ایشیا کی علمی، ادبی اور ثقافتی روایات لے کر آئے تھے جو اسلامی اور ایرانی روایات کا تسلسل تھیں۔ ان میں فنِ خطاطی کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ بابر خود ماہر خطاط تھا۔ اس نے اپنا خط بابری ایجاد کیا تھا جو رواج نہ پاسکا۔ اس کے عہد میں ماہرِ خطاط موجود تھے۔ اس کے بعد ہمایوں تخت نشین ہوا۔ وہ بھی اس فن کا بڑا قدردان تھا۔ اس کے درباری اُمرا میں خواجہ سلطان علی بہت ممتاز خطاط تھے۔ اس کے علاوہ عبد الصمد شیریں رقم جیسا ماہرِ فن ہمایوں کے دربار سے وابستہ ہوا تھا۔ وہ ایک اچھا مصور بھی تھا۔ ان سب ہی باکمال فنکاروں کی خطاطی و مصوری کے نمونے ہندوستان، ایران اور یورپ کے کسی نہ کسی میوزیم یا کتب خانے میں ملیں گے۔

خطِ نستعلیق کا عروج عہدِ اکبری سے ہوا۔ اکبر ان پڑھ تھا مگر اس نے خطاطی اور خوشنویسی کی بہت قدر کی اور ان کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کیا۔ اس نے آئینِ اکبری میں جو نصابِ تعلیم تجویز کیا ہے اس میں اس فن کی تعلیم پر بہت زور دیا ہے۔ اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ ہندوستانی خطاطوں نے اس فن کو نکھارنے میں ایسے استادانہ کمالات دکھائے کہ جن کو دیکھ کر ایرانی بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔

مغلیہ دور میں نسخ اور نستعلیق دونوں خط رائج تھے۔ لیکن خطِ نستعلیق اپنی زیبائی

اور دلکشی کے باعث مقبولِ عام تھا۔ اس فن کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اچھے لکھنے والوں کو ان کی خواہش سے زیادہ معاوضہ ملتا تھا۔ اس لئے ہر خطاط دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ اس کو ایک معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا' اور اسی لئے عام طور پر اس فن کی تحصیل کا شوق بڑھنے لگا۔ اکبر اور جہانگیر کی دریا دلی کی شہرت سن کر دیگر علوم و فنون کے ماہرین کی طرح' ایران و خراسان کے ماہر خطاطوں نے ہندوستان کا رخ کیا' اور ان کی بدولت اس فن کی رفتارِ ترقی میں اضافہ ہوا۔ ایران سے آنے والے ماہرین میں عبدالرشید دیلمی جیسے ممتاز خطاط کا شاگرد رشید میر عماد' معروف بہ آغا رشیدا بھی تھا۔ مغلیہ دور کے وزراء اور امراء میں بعض اچھے خوشنویس تھے۔ اکبر کے عہد میں مُلّا عبدالقادر بدایونی' عبدالرحیم خانخاناں۔ میر منشی اشرف خاں میر فتح اللہ شیرازی باکمال خوشنویس تھے۔ اس عہد کے سب سے بڑے خطاط مُلّا محمد حسین کشمیری (متوفیٰ ۱۰۲۲ ہجری) تھے۔

اکبر کے بعد جہانگیر کا دور شروع ہوا۔ وہ بھی خوشنویسی کا دلدادہ تھا۔ اس نے اچھے خوشنویسوں کی لکھی ہوئی وصیلوں اور قطعوں کا البم بنا کر اپنے پاس رکھا تھا۔ اس زمانے میں کئی بلند مرتبہ ہندو خوشنویس بھی تھے جن میں رائے منوہر بہت مشہور ہے' اس کی تربیت خود اکبر نے کی تھی۔ جہانگیر کے زیر سایہ پروان چڑھا۔ راجہ ٹوڈرمل کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

خطاطی اور خوشنویسی کو عہدِ شاہ جہاں میں بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس کے زمانے میں میر عماد قزوینی کے شاگرد عبدالرشید دیلمی نے خطِ نستعلیق کو نکھارا' اور اس میں ایک امتیازی شان پیدا کی۔ اسی زمانے میں کفایت اللہ خاں نے خطِ شکست کو رائج کیا۔ شاہ جہاں سے پہلے بھی خطِ نستعلیق کو ترقی ہوئی۔ لیکن جب عبدالرشید دیلمی ہندوستان آئے تو یہاں فن خوشنویسی اور خط نستعلیق کی تجدید ہوئی۔ ہندوستان میں دیلمی کے شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ شاہ جہاں نے ان کو اپنے شاہزادوں کا استاد مقرر کیا۔ سب سے زیادہ محنت اور شوق سے داراشکوہ نے یہ فن حاصل کیا اور اس کی سرپرستی بھی کی۔ تذکرۂ خوشنویساں میں لکھا ہے کہ:

باوجود اشتغال امور شاہزادگی و دیگر امور بعد یہ آقا عبدالرشید دیلمی

شاید کسی مثل او نوشتہ باشد"

اسی عہد میں مشہور شاعر اور نثر نگار چندر بھان برہمن بھی تھا۔ وہ خوشنویسی میں بہت مہارت رکھتا تھا۔ شاہ جہاں کو اس فن سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ خطِ نستعلیق کو بہت پسند کرتا تھا۔

شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے ہندوستان کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور طویل عرصے تک اپنا اقتدار قائم رکھا۔ وہ نہایت اچھا خوشنویس اور خط نسخ میں ماہر تھا۔ اپنے ہاتھ سے قرآن شریف لکھ کر ہدیہ کرتا تھا' اور اسی کی آمدنی سے اپنے ذاتی اخراجات پورے کرتا۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ یورپ کے بعض ملکوں کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ اس کے عہد میں اس فن کو ترقی ہوئی۔ اس عہد کا سب سے بڑا اور ممتاز خطّاط سید علی خاں جواہر رقم تھا۔ جو عالمگیر کا درباری کاتب بھی تھا۔ اس کے دربار میں دو ماہر کاتب اور تھے جو نستعلیق لکھنے میں ممتاز تھے' میر محمد طاہر اور میر محمد باقر۔ جب سنہ ۱۱۱۸ ہجری (مطابق سنہ ۱۷۰۶ء) اورنگ زیب نے وفات پائی' تو اس کے بیٹوں میں حصولِ اقتدار کے لئے خانہ جنگی ہونے لگی۔ اور سارے ملک میں افراتفری کا دور دورہ ہو گیا۔ کبھی ایک شاہزادہ حکمران ہوا' کبھی دوسرا۔ کوئی ایک زیادہ عرصہ حکمران نہ رہ سکا۔ صرف محمد شاہ نے تیس سال حکومت کی۔ اس دوران فنونِ لطیفہ پر کچھ نہ کچھ توجہ رہی' مگر فنِ خطّاطی پر بہت کم توجہ کی گئی۔ تاہم اس فنِ شریف پر جمود و تعطل طاری نہیں ہوا۔ کیونکہ ہوشیار فنکار حسب موقع و فرصت اپنے فن کو ابھارنے اور نکھارنے میں مصروف رہے۔ یہ سلسلہ مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک رہا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی بہت اچھے خوشنویس تھے۔ ان کے زمانے میں بعض امراء اور علماء بھی اس فن کے قدردان تھے۔ ان میں مرزا اسد اللّٰہ خاں غالبؔ' نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ' مفتی صدر الدین آزردہؔ حکیم مومن خاں مومنؔ جیسے یگانہ روزگار فضلاء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ فنِ خطاطی اور خوشنویسی کے تین بڑے مرکز تھے' جہاں اس نے ترقی کی اور اس کے حسن و دلآویزی میں اضافہ ہوا اور نئے نئے اندازِ تحریر سامنے آئے۔ دہلی۔ لکھنؤ اور لاہور۔ یہاں لاہور سے قطع نظر' دہلی اور لکھنؤ کے خطّاطوں کا مختصر حال تحریر کیا جا رہا ہے۔

دہلی کے ماہر خوشنویس
۱۱۲۱ ہجری سے ۱۲۷۴ ہجری تک

مغلیہ حکومت کے عہدِ زوال میں ہی دہلی کے اندر اچھے اور ماہر خوشنویسوں کی اچھی خاصی تعداد تھی جو اپنے فن کو ترقی دینے میں مصروف رہے۔ آخری دور میں کئی پریس بھی قائم ہو گئے تھے جہاں اردو و فارسی کتابوں اور اخبارات کی طباعت و اشاعت ہوتی تھی۔ سب سے مشہور اخبار "دلّی اردو اخبار" تھا جس کو محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نکالتے تھے۔ اس کے علاوہ اور اخبارات بھی تھے۔ ان کی کتابت کے لئے اچھے کاتبوں اور خوشنویسوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد عارضی طور پر ختم ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں کاتبوں اور خوشنویسوں کو بھی افراتفری کا شکار ہونا پڑا۔ کچھ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ بعض نے ایسے مقامات کا رخ کیا جہاں امن و سکون کے آثار نظر آئے۔ مثلاً لکھنؤ، رام پور۔ جہاں اس فن کے قدر دان موجود تھے اور حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ دہلی کے خوشنویسوں اور خطاطوں میں جنہوں نے اس فن کو محنت اور توجہ سے ترقی دی اور جن کے ذریعے اس فن کی آبیاری ہوتی رہی۔ ان میں سے بعض اساتذہ فن کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ جن کی محنت اور توجہ سے اس فن کی آبیاری ہوتی رہی۔ ان میں سے بعض اساتذۂ فن کا مختصر تعارف پیشِ نظر ہے۔ ان میں بعض وہ ہیں جو دلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور وہیں کے ہو گئے۔

شیخ نور اللہ نسخ اور نستعلیق کے ماہر استاد تھے۔ عبد الرحیم فرمان نویس کے شاگرد تھے۔ ان کی تحریر میں گزشتہ اساتذۂ فن کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ تذکرۂ خوشنویساں کے مؤلف نے ان کی بہت تعریف لکھی ہے۔

حافظ نور اللہ یہ شیخ نور اللہ کے شاگردِ رشید تھے۔ آقا عبد الرشید کے طرز پر لکھتے تھے۔ ان کی مہارت فن کا اعتراف تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، دہلی میں ان کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی۔ جب حافظ نور اللہ کو دہلی میں علم و فن کی کساد بازاری نظر آئی تو لکھنؤ چلے گئے۔ جہاں ان کی بدولت اس فن نے نئی زندگی پائی۔ اور ان کے لکھنوی شاگردوں نے خوشنویسی کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ ان کا مفصّل حال لکھنوی خوشنویسوں کے ذکر میں لکھا گیا ہے۔

خلیفہ سلطان شیخ نور اللہ کے دوسرے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بہت مشّاق خوشنویس تھے۔ مصنّف تذکرۂ خوشنویساں نے لکھا ہے کہ:

این مرد بسیار مشّاق بودہ، در مشق شبانہ روز دماغ سوزی
خط را بکمال اسانیدہ

آخر عمر میں ان کو خوش حالی میسّر ہوئی اور عیش و آرام نصیب ہوا، خط نستعلیق میں کمال حاصل تھا۔ دہلی سے علی گڑھ چلے گئے تھے، وہیں وفات پائی۔[1]

شاہ اعزالدین دہلی کے معززین میں شمار کئے جاتے تھے۔ خوشنویسی کا بہت شوق تھا۔ آقا عبد الرشید کے طرز پر نستعلیق کی خوب مشق کی تھی۔ دہلی کے عمائدین میں جن کو خوشنویسی کا شوق تھا وہ انہیں کی شاگردی اختیار کرتے تھے۔ ان کے دو شاگرد بہت ماہر خوشنویس ہوئے ہیں۔ ایک محمد عامل، دوسرے نجم الدین۔

حافظ محمد علی آخری مغلیہ دربار کے خوشنویس تھے۔ مرزا جواں بخت کے استاد مقرر ہوئے۔ خط نستعلیق میں مہارت حاصل تھی اور آقا عبد الرشید کے طرز کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے بیٹے حافظ عبد الغفور بھی دونوں خطوں میں ماہر تھے۔ وہ جواں بخت کے بیٹے مرزا خرّم کے استاد بھی تھے۔

محمد حفیظ خاں مغلیہ دور کے آخری زمانے میں، دہلی کے مشہور خطّاط و خوشنویس تھے۔ دہلی کے اکثر خطاطوں کے استاد تھے۔ انکے شاگردوں میں میر ابو الحسن عرف میر کلّن کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ آخر عمر میں اکبر شاہ ثانی کے دربار سے منسلک ہوئے۔ خط نسخ میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔ خط شکستہ اور ثلث میں بھی کمال حاصل تھا۔ انہوں نے ۱۸۶۷ء میں بمقام دہلی وفات پائی۔

میر محمد حسین میر کلّن کے بیٹے اور خوشنویسی میں انہیں کے شاگرد رشید

---

[1] تذکرۂ خوشنویساں، صفحہ ۶۲

تھے. بہت ماہر خطاط اور خوشنویس تھے۔ آخر عمر میں حالات کی ناموافقت کے باعث دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے تھے. اور وہاں مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے وابستہ ہو گئے تھے جہاں ان کو میر منشی کے عہدے پر فائز ہونے کا موقع ملا۔

محمد جان یہ محمد عاشوری کے بیٹے تھے. بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی کے زمانے میں ان کے استاد مقرر ہوئے. بہت اچھے خوشنویس تھے. ولی عہد کے یہاں خوشنویسی اور کتابت کا کام ان کے سپرد تھا. خط نسخ و نستعلیق دونوں میں مہارت حاصل تھی. میر کلّن کے شاگرد تھے۔

محمد یار خط نستعلیق کے ممتاز اساتذہ میں تھے. دہلی میں ان کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی. ان کے نواسے بدر الدین خاں ہر قسم کی تحریروں میں مہارت رکھتے تھے. ان کو نسخ اور نستعلیق کی مہریں بنانے کا بے حد شوق تھا. دہلی کے محلّہ دریبہ کلاں میں رہتے تھے. ان کو ہر رسم الخط لکھنے میں کمال حاصل تھا. وہ بھی آقا عبدالرشید کے انداز تحریر کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

غلام محمد دہلوی بہت مشہور اور باکمال خطاط ماہر خوشنویس اور عربی و فارسی کے عالم تھے. شعر و شاعری کا شوق بھی تھا. نسخ و نستعلیق کے علاوہ دوسرے خطوں میں بھی مہارت حاصل تھی. انہوں نے مشہور خطاط و خوشنویس میر امیر علی رضوی پنجہ کش کی تربیت میں حصہ لیا اور اس فن کو بلندی پر پہنچایا. ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تذکرہ خوشنویساں تالیف کیا جو فارسی زبان میں خوشنویسوں کے حالات پر پہلا تذکرہ ہے. وہ محمد حفیظ خان خوشنویس کے شاگرد تھے. ہفت قلم، مشہور تھے. آخر عمر میں دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے انہوں نے ۱۸۲۴ء میں وفات پائی۔

محمد امیر رضوی پنجہ کش بہت مشہور اور باکمال خطاط تھے. ان کو پنجہ کشی، مصوری اور نقاشی میں بھی کمال حاصل تھا. خط نستعلیق میں خاص مہارت حاصل تھی. سر سید احمد خاں نے اپنی تصنیف آثار الصنادید میں ان کے اوصاف پر بڑی عقیدت سے روشنی ڈالی ہے اور ان کے کمالات فن کا اعتراف کیا ہے. مصنف تذکرہ خوشنویساں نے بھی ان کی تربیت میں خاص طور پر

توجہ کی اور ان کو ماہر فن بنایا۔ پنجہ کش کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے۔

فنِ خطّاطی و خوشنویسی کے مذکورہ اساتذہ فن کے علاوہ دہلی میں خوشنویسوں اور خطّاطوں کا بڑا گروہ موجود تھا۔ ان میں مرزا عباد اللہ بیگ۔ عبدالرسول قند ہاری۔ مولوی محمد خلیل۔ خواجہ نقش بند خان۔ میر سوز بہت مشہور ہیں۔ بعض کے حالات لکھنؤ کے خطّاطوں کے ضمن میں لکھے گئے ہیں۔

باب چہارم

خطاطی کا دوسرا بڑا مرکز لکھنؤ زمانۂ قدیم سے لکھنؤ ایک علمی وفنی مرکز کی حیثیت سے مشہور رہا ہے۔ اس کی آبادی زیادہ نہ تھی۔ لیکن اس کے اطراف میں چند ایسے مردم خیز اور بارونق قصبات موجود تھے، جن کو علوم و فنون کا سرچشمہ کہا جاتا ہے۔ ان قصبوں میں اس دور کے باکمال علماء اور دانشوروں کی قائم کی ہوئی درس گاہیں تھیں، جہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملک کے دور دراز حصوں سے طالب علم تحصیلِ علم کے لئے آتے تھے۔ خاص طور پر خیرآباد۔ سندیلہ۔ بلگرام۔ امیٹھی بندگی میاں۔ کاکوری۔ گوپامئو۔ ردولی۔ دریاآباد اور بعض دیگر قصبات۔ قدیم دور سے قطع نظر لکھنؤ کی آبادی اور رونق اس زمانے میں بڑھ گئی جب یہ سلطنت اودھ کا پایۂ تخت بنایا گیا۔ چونکہ مغل حکمران محمد شاہ کے عہد سے دلی پر ادبار کی گھٹائیں چھا گئی تھیں اور علم وادب کی محفلیں سونی ہونے کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ ملک کے مختلف صوبے خود مختاری کا اعلان کر رہے تھے اور دلی کی مرکزی حکومت سے رشتہ توڑ کر اپنی حکمرانی کا اعلان کرنے والوں میں صوبہ اودھ پیش پیش تھا۔ اور اس وقت اودھ ہی سب سے زیادہ پرسکون اور خوش حال صوبہ تھا جس کا پایۂ تخت پہلے فیض آباد رہا لیکن جلد ہی لکھنؤ کو یہ شرف حاصل ہوا۔ یہاں کی خوش حالی اور فارغ البالی کی شہرت سن کر دلّی کے ادیب، شاعر اور دوسرے اہل علم و ہنر لکھنؤ کا رخ کرنے لگے۔ ان میں دلّی کے خطاط اور خوشنویس بھی تھے۔ مختصر عرصہ لکھنؤ ماہرینِ فن کا قابل رشک مرکز بن گیا۔ خوشنویسی کو بھی پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ اس زمانے میں عام طور پر خوشنویسوں کے

ؔ اودھ کے ایسے قصبات اور بھی ہیں جہاں مختلف علوم وفنون کے ماہرین موجود تھے جیسے دیوی ملیح آباد۔ کسمنڈی۔ سترکھ۔ سلون۔ موہان۔ محمود آباد۔ سہال۔ کنتور۔ نصیر آباد۔ جائس

لکھے ہوئے طغرے، وصلیاں، کتبات گھروں میں آرایش کے لئے آویزاں کئے جاتے تھے۔ یہ ذوق وشوق خواص کے علاوہ عوام میں بھی تھا۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ نے اپنی مشہور کتاب "گزشتہ لکھنؤ" میں لکھا ہے:

> ان دنوں امراء اور شوقین لوگ اپنے مکانوں کو بجائے تصویروں کے قطعات سے آراستہ کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے علی العموم قطعوں کی بے انتہا مانگ تھی، اور جہاں کسی اچھے خوشنویس کے ہاتھ کا قطعہ مل جاتا اس پر لوگ پروانوں کی طرح گرتے اور آنکھوں سے لگاتے۔ اس سے سوسائٹی کو یہ فائدہ پہنچتا کہ اکثر اخلاقی اصول اور ناصحانہ فقرے یا اشعار ہمیشہ پیش نظر رہتے، اور گھر میں اخلاقی سبق ملتا رہتا۔ اور خوشنویسی کو یہ فائدہ پہنچتا کہ خوشنویس عمدہ وصلیاں لکھ کر تیار کرتے اور اسی میں گھر بیٹھے دولت مند ہو جاتے[1]

قطعات اور وصلیوں کی مقبولیت اور لوگوں کے ذوق وشوق نے خوشنویسوں کی حوصلہ افزائی کی۔ فنکاروں نے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دی، جس کی وجہ سے فن کو روز افزوں ترقی ہوئی۔ خط نستعلیق کی نوک پلک درست کر کے اس کو اور دلکش بنایا گیا۔ دائروں کی گولائی میں جدّتیں کی گئیں۔ اس دور کے خوشنویسوں کی تعداد بہت ہے۔ ان کے مختصر حالات تذکرہ خوشنویسان، اور بعض دوسرے تذکروں میں موجود ہیں یہاں لکھنؤ کے چند خوشنویسوں کے نام مختصر تعارف کے ساتھ لکھے جا رہے ہیں۔

محمد اسلم ماہر فن نستعلیق نگار تھے۔ انہوں نے آقا عبدالرشید کا طرز اختیار کیا تھا۔

میر عطا حسین تحسین یہ محمد باقر طغرا نویس کے بیٹے تھے۔ مرصع رقم خطاب پایا تھا۔ نواب شجاع الدولہ کی فرمایش پر قصہ چہار درویش کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔[2] نسخ اور نستعلیق دونوں میں مہارت

---

[1] گزشتہ لکھنؤ از شرر صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸ مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی

[2] اس ترجمہ کا نام نوطرز مرصع رکھا تھا۔ یہ کتاب ۱۷۹۵ء میں مکمل کی تھی۔

حاصل تھی۔ وہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے شعبہ تصنیف و ترجمہ سے بھی وابستہ رہے۔[1]

سیّد اعجاز رقم خاں باکمال خطاط تھے۔ تذکرہ خوشنویساں میں لکھا ہے کہ "فی الواقع کاتب، خوشنویس باکمال بودہ وبطرزِ فاضل تیریں و دلچسپ می نوشت"

حافظ نور اللہ خوشنویسی اور خطاطی کے استاد یگانہ تھے۔ دہلی میں اپنے فن کے کمالات دکھانے کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ دربار میں بہت عزت ملی۔ ہفت بند کاشی کی نقل کرنے کا حکم ملا۔ جو آقا عبدالرشید کا لکھا ہوا تھا۔ اتنے دلکش اور دیدہ زیب خطِ نستعلیق میں لکھا تھا کہ دیکھنے کے بعد نظر ہٹانے کو دل نہ چاہتا تھا۔ تذکرہ خوشنویساں کے مؤلف نے ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے، انہوں نے لکھنؤ میں ان سے ملاقات بھی کی تھی۔ اور مل کر بہت متاثر ہوئے، لکھتے ہیں کہ:

> حافظ مردے بود متواضع وخلیق وخاکسار، حق پسند وانصاف
> آشنا، از عجب وتکبر جدا بودہ است۔۔۔۔۔ در آن عصر ہفت
> بند کاشی بموجب فرمائش آصف الدولہ بہادر نقلِ آقا نوشتہ
> بودہ چہ گو ہم کہ چہ جادو رقمی در آن کار بردہ، باغ وبہارے بود
> بینندہ را دلِ مرگز از دیدن او سیر نمی شد[2]

ان کی مہارت فن اور علمی استعداد کے پیشِ نظر نواب آصف الدولہ نے ان کو دفتر انشار کا افسرِ اعلیٰ بنادیا۔[3] ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیاں گراں قیمت پر فروخت ہوتی تھیں۔ مولانا شرر نے لکھا ہے کہ ان کی تحریر ایک روپیہ فی حروف کے حساب سے فروخت ہوتی تھی[4] حافظ نور اللہ کو بہت شہرت اور عزت حاصل ہوئی۔ ان کے بیٹے حافظ ابراہیم بڑے باکمال خوشنویس تھے جن کا فیض اب تک جاری ہے۔ حافظ نور اللہ کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے۔

ایک بار حافظ نور اللہ سے نواب سعادت علی خاں نے فرمایش کی کہ میرے لئے گلستان لکھ دیجئے۔ حافظ موصوف دوسرے کی فرمائش پر کچھ لکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ مگر

---

۱ داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری صفحہ ۵۸۔
۲ تذکرہ خوشنویساں صفحہ ۶۴ ۳ تحقیقات ماہر ۴ گزشتہ لکھنؤ، ذکر خوشنویساں۔

نواب کا حکم ٹالنا مشکل تھا۔ لیکن کہہ دیا کہ اس کام کے لئے اتنی گڈی کاغذ (۸۰ رم) نشو قلم بنانے والے چاقو۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہزار نیزے قلموں کے لئے منگوا دیجیے تو لکھ دوں گا۔ نواب نے حیرت سے پوچھا، اس قدر سامان؟ جواب دیا جی ہاں میں تو اتنا ہی سامان خرچ کرتا ہوں۔ نواب نے انتظام کر دیا۔ مگر سات باب لکھے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ آٹھواں باب انکے صاحبزادے حافظ ابراہیم نے پورا کر دیا۔[1]

مرزا محمد علی اس عہد کے ماہر خطاط و خوشنویس تھے۔ ان کے والد مرزا خیر اللہ شاہی فرمان نویس تھے۔ آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آئے۔ خط نستعلیق میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی۔ ان میں مرزا وزیر علی، قاضی نعمت اللہ، خلیفہ بخش اللہ اور میر نثار علی خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔ مشہور شاعر میر سوز بھی ماہر خطاط و خوشنویس تھے جو اسی زمانہ میں لکھنؤ آ گئے تھے

مقبول نبی خاں یہ مشہور اردو شاعر انعام اللہ خان یقین کے بیٹے تھے۔ فن خوشنویسی میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ نستعلیق بہترین لکھتے تھے۔ مرزا محمد علی کے شاگرد تھے۔ خط جلی و خفی دونوں یکساں لکھتے تھے۔ لکھنؤ میں سکونت اختیار کی تھی۔

حافظ نور اللہ اور قاضی نعمت اللہ کی بدولت لکھنؤ خوشنویسوں کا گہوارہ بن گیا تھا۔ حافظ نور اللہ کے دو شاگرد بہت نامور ہوئے۔ دونوں کا فن عروج پر تھا، حافظ ابراہیم اور سرب سکھ۔ ان دونوں باکمالوں کی تربیت سے منشی عبدالحمید۔ منشی منسارام کشمیری اور مولوی اشرف علی بڑے باکمال نستعلیق نگار ہو گئے۔ ان کے ایک باکمال شاگرد مولوی ہادی علی تھے۔ جو نسخ اور نستعلیق دونوں میں ماہر و ممتاز تھے۔

اس زمانے میں سندیلہ کے منشی عبدالحیّ کو اس فن میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ مولانا شرر نے لکھا ہے کہ مولوی ہادی علی، منشی عبدالحیّ کے شاگرد تھے۔ حالانکہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے ان کو حافظ ابراہیم کا شاگرد لکھا ہے۔ مولوی ہادی علی کے دو ممتاز شاگردوں نے اس فن کو بہت ترقی دی، ایک منشی شمس الدین اعجاز رقم دوسرے منشی

---

[1] گزشتہ لکھنؤ از شرر صفحہ ۱۱۸

حامد علی، منشی شمس الدین نے خط نستعلیق کو اتنے عروج پر پہنچایا کہ اس کے آگے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کوئی بڑھ نہ سکا۔ آخری دور کے یہ تمام نامور اور باکمال اساتذہ فن کسی نہ کسی حیثیت سے مطبع نولکشور سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کے تفصیلی حالات مطبع نولکشور سے وابستہ خوشنویسوں کے ذکر میں لکھے جائیں گے۔

سلطنت اودھ کا خاتمہ اور خطاطی کا انحطاط

۱۸۵۶ء میں انگریزی حکومت نے اودھ کے آخری حکمران واجد علی شاہ کو تخت و تاج سے محروم کر دیا اور زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس اچانک اور غیر متوقع واقعے نے عوام و خواص میں خوف و ہراس پیدا کر دیا۔ اور انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ واجد علی شاہ کو کلکتہ کے علاقے مٹیا برج میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس زمانے میں ملک کے دوسرے مقامات پر بھی لوگ انگریزوں کی دراز دستیوں سے پریشان ہو رہے تھے، اور در پردہ ان کے اقتدار کو ختم کرنے کی جدوجہد جاری تھی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا تسلط ختم کرنے کے لئے تحریک جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔ اودھ کے عوام و خواص پہلے سے اس کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ وہ بھی اس جنگ میں شریک ہو گئے۔ کئی ماہ کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ سارا ملک اس تحریک سے متاثر ہوا۔ لیکن فتح انگریزوں کو ملی۔ انہوں نے دل کھول کر لکھنؤ کو تباہ و برباد کیا۔ اس پُر آشوب دور میں اہل علم و فن نے شہر چھوڑ کر دوسرے مقامات پر پناہ لی یا اپنے گھروں میں بند رہ کر جانیں بچائیں۔ خطاط و خوشنویس بھی بے روزگار ہو کر پریشان حالی میں ادھر اُدھر منتشر ہو گئے جو شہر میں رہ گئے وہ تنگ دستی اور فاقہ کشی سے دوچار ہوئے۔ اس افراتفری کے دور میں کسی کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ جب امن و امان قائم ہوا تو خوشنویسوں کے سرپرست رؤسا اور امرا خود پریشان خاطر اور تباہ حال ہو چکے تھے۔ ایسی حالت میں خوشنویسوں کی سرپرستی کون کرتا۔ چند اہل علم و فضل اور فنکار مٹیا برج کلکتہ چلے گئے تھے جہاں واجد علی شاہ کا قیام تھا وہ عالموں، شاعروں اور دیگر فنکاروں کی حسب حیثیت قدر و عزت کرتے تھے۔ خود بھی خوشنویس تھے اور اس فن کے ماہرین کی قدر و عزت کرتے تھے۔ کئی خوشنویس مٹیا برج پہنچ گئے تھے جن کو معزول شاہ اودھ کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی، اور گزر بسر کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اکثر

فنکاروں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض نے رام پور کا رخ کیا جو ایک پر امن مقام تھا اور وہاں کے حکمران اہل علم وفن کے قدر شناس تھے۔ اس زمانے میں لکھنؤ کے اندر اس دور کے ممتاز اور ماہر خوشنویسوں میں منشی امیر اللہ تسلیم، طوطا رام شایاںؔ، مولوی ہادی علی اور منشی اشرف علی جیسے معروف ماہرین فن موجود تھے۔ اور یہ سب بھی ابتلاؤ آزمائش کے اس دور سے گزر چکے تھے۔ اور خوشنویسی کے بجائے کتابت (کاپی نویسی) کو روزی روٹی کا ذریعہ بنایا تھا۔ خوشنویسی اور کتابت میں بہت فرق ہے۔ اس آخری دور میں خوشنویسوں کی قدر دانی کم ہو گئی تھی۔ جب لیتھو پریس کا سلسلہ جاری ہوا تو کتابت کی طرف زیادہ توجہ کی جانے لگی اور اس کو ایک معمولی پیشہ خیال کیا جانے لگا۔ اسی لئے منشی امیر اللہ تسلیم یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

کوئی پیدا ہوا زہد و عبادت کے لئے ۔۔۔ کوئی پیدا ہوا عالم کی حفاظت کے لئے
ہم سیہ نامہ تھے مانندِ قلم اے تسلیم ۔۔۔ آئے اس صفحۂ ہستی پہ کتابت کے لئے

حالانکہ کتابت و خوشنویسی لازم و ملزوم ہیں۔ کاتب و خوشنویس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور پیشے کے اعتبار سے دونوں یکساں معزز ہیں۔

خوشنویسی اور کتابت میں کیا فرق ہے

خوشنویسی ایک دلکش اور دیدہ زیب فن ہے۔ اس کو فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں مصوری اور نقاشی سے زیادہ کشش اور تاثیر ہے۔ خوشنویس ایک سطر کی عبارت یا شعر کے ایک مصرعے میں کئی دن صرف کر کے ہر لفظ کی نوک پلک درست کرنے اور سنوارنے میں اپنی پوری ذہانت سے کام لیتے تھے" اور اس کو خوشنما اور پرکشش بنانے میں سارا زورِ قلم صرف کرتے تھے۔ اسی لئے اُن کو گرانقدر معاوضہ اور انعامات ملتے تھے۔ بخلاف اس کے کتابت ایک تجارتی تحریر ہے، جس میں خوشنویسی کی ساری خوبیاں پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے اس کے ایک دن میں چار پانچ صفحات لکھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں خطاطی اور خوشنویسی کے سارے محاسن کس طرح سما سکتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کتابت خوشنویسی کے زوال کا سبب بن گئی۔ مولانا شررؔ نے لکھا ہے

مگر افسوس ہندوستان سے قطعات اور کتبوں کا رواج اٹھتا جا رہا ہے اور ان کی جگہ تصویروں نے لے لی ہے"

جس کی وجہ سے اگلے نفیس و مہذب شرعی آرائش کے مٹ جانے
کے ساتھ خوشنویسی بھی ہندوستان سے اٹھ گئی۔ اب کاتب ہیں،
خوشنویس نہیں ہیں۔ دو ایک خطاط مشہور بھی ہیں، وہ بھی مجبور
ہیں کہ کاپی نویسی اور کتابت کرکے پیٹ پالیں۔ جو چیز کہ اصل
خوشنویسی کی دشمن ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ اگلے خوشنویس کتابت کو
اپنی شان سے ادنیٰ سمجھتے تھے۔ اور خیال کرتے تھے کہ جو شخص پوری
پوری کتابیں لکھے گا وہ غیر ممکن ہے کہ اول سے آخر تک اصول و
قواعد خوشنویسی کو پوری طرح نباہ سکے اور سچ یہ ہے کہ جتنی
محنت و مشقت وہ لوگ ایک ایک وصلی کی درستی میں کرتے تھے،
اس کی عشر عشیر محنت بھی کاتب پوری کتاب کے لکھنے میں نہیں کرسکتے۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ کتابت اور خوشنویسی میں فرق ہے۔ لیکن مولانا شرر کی رائے سے کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ خوشنویسی اور کتابت ایک دوسرے کی نہ ضد ہیں نہ مخالف۔ اصل بات یہ ہے کہ خوشنویسی فن کے اصول و ضوابط کو پیش نظر رکھ کر نہایت محنت سے کوئی عبارت یا شعر یا مقولہ تحریر کرتے تھے اور قدر شناس اس کو آرائش کے لئے منھ مانگے دام دے کر خرید لیتے تھے۔ امراء اور وزراء گرانقدر انعامات دے کر خوشنویس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ لیکن جب لیتھو پریس قائم ہوئے تو کتابوں کی طباعت کے لئے کتابت کی ضرورت پڑی۔ اس وقت کے مطابع کے مالکوں نے خوشنویسوں کو اس طرف متوجہ کیا جنہوں نے اپنی معاشی ضروریات سے مجبور ہوکر کتابت کا پیشہ اپنایا۔ اس کا دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ ملک ایک انقلابی دور سے گزر رہا تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ امراء و وزراء کی مالی حالت خراب ہوگئی جس کی وجہ سے فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کا ذوق و شوق کم ہوگیا۔ اسی حالت میں خوشنویسوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اس قسم کا جو کام ذریعہ معاش بن سکے اس کو اختیار کریں۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ کتابت کے رواج کے باعث خوشنویسی کو نقصان پہنچا،

---

[1] گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۴۸ مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

ایسے کاتبوں کی بڑی تعداد ہر دور میں موجود رہی ہے جو کتابت کے ساتھ خوشنویسی کے اعلیٰ اصولوں کی پابندی کرتے تھے جس کے اعلیٰ معیاری نمونے ان مطبوعہ کتابوں کی صورت میں موجود ہیں جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے مطبع سلطانی لکھنؤ میں اور اس کے بعد مطبع نولکشور اور مطبع منشی رحمت اللہ رعد کانپور کی بعض مطبوعہ کتابیں خوشنویسی کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہیں۔

مطبع کا قیام اور کتابت کا آغاز

مطبع کے قیام سے قبل دو قسم کے خوشنویس تھے ایک وہ جو وصلیاں، قطعات اور طغرے لکھتے تھے۔ وہ چند حروف کی نوک پلک درست کرنے میں کئی کئی دن صرف کرتے تھے۔ ان کی تحریریں خوش ذوق امراء و رؤسا اور علم و ہنر کے دوسرے قدردان، گرانقدر دے کر خرید لیتے تھے۔ دوسری قسم میں وہ خطاط اور خوشنویس تھے جو کتابوں کی نقلیں کرتے تھے۔ جب طباعت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اس لئے جس کو کسی کتاب کی ضرورت پیش آتی وہ اصل مخطوطے یا اس کی نقل کی نقل کرا لیتا تھا۔ یہ سلسلہ زمانۂ قدیم سے دوسرے ملکوں میں بھی رائج تھا۔ جب مطبع کا قیام عمل میں آیا تو یہ نقل نویس کتابت کرنے لگے۔

ہندوستان میں فن طباعت کا آغاز یورپی ممالک کے صنعت کاروں کی بدولت ہوا۔ ۱۵۵۰ء میں پہلا پریس پرتگالیوں نے جنوبی ہندوستان میں قائم کیا تھا۔ اس کے بعد سری رام پور کی عیسائی مشنریوں نے کئی مقامات پر پریس قائم کئے اور اپنی تبلیغی کتابیں ہندوستان کی کئی زبانوں میں شائع کیں، ان میں اردو زبان کی چند کتابیں بھی تھیں۔ اردو فارسی کتابوں کی باقاعدہ طباعت کا کام اس وقت شروع ہوا جب ۱۷۷۹ء کو کلکتہ میں پہلی بار پریس قائم ہوا۔ ۱۸۰۰ء میں ہندوستانی پریس کا قیام عمل میں آیا اور اسی سال فورٹ ولیم کالج کلکتہ قائم ہوا۔ جہاں اردو فارسی کی کتابوں کو خاص اہتمام سے چھاپا گیا، لیکن یہ طباعت کا سارا کام اس وقت تک ٹائپ کے ذریعے ہوتا تھا جس کے حروف مختلف دھاتوں سے ڈھالے جاتے تھے اور لکڑی سے بھی بنائے جاتے تھے۔ ٹائپ کے کچھ عرصہ بعد لیتھو طریقۂ طباعت رائج ہوا جس کے لئے کتابت لازمی تھی۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پسندیدہ اور مقبول خط نستعلیق

تھا۔ لکھنؤ میں نصیر الدین بادشاہ اودھ (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء) نے ایک انگریز ماہرِ فن کی مدد سے پہلا پریس قائم کیا جس کا نام مطبع سلطانی یا سلطان المطابع تھا۔ اس کے قیام کے بعد لکھنؤ میں اہلِ علم و فن کی خواہش پر متعدد پریس قائم ہوئے۔ مطبع سلطانی کی طبع کی ہوئی کتابیں فنِ خطّاطی و خوشنویسی کے نقطۂ نظر سے بھی معیاری ہیں۔ جن کی کتابت اس دور کے ماہر خوشنویسوں نے کی تھی۔ مطبع سلطانی سرکاری مطبع تھا۔ اس کے علاوہ مطبع حاجی الحرمین اور مطبع مصطفائی کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ لیتھو طریق طباعت کے آغاز کے بعد عام طور پر خوشنویسوں نے کتابت شروع کر دی، تاہم بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے اس سے اجتناب کیا اور اپنے فن کو کتابت سے بلند رکھنے کا مسلک اختیار کیا۔ اور بدستور خوشنویسی کو ترقی دینے میں لگے رہے۔

۱۸۵۷ء میں انگریزی اقتدار کے خلاف تحریکِ آزادی شروع ہوئی۔ اس سے قبل ۱۸۵۶ء میں اودھ کے بادشاہ واجد علی شاہ کو انگریزوں نے حکومت سے معزول کر دیا تھا اس واقعہ کا عوام و خواص پر گہرا اثر تھا، اور سب کے دلوں میں اس غاصبانہ عمل کے خلاف انتقامی جذبات بھڑک اٹھے جس کے نتیجے میں ملک گیر تحریک آزادی کا آغاز ہوا۔ لکھنؤ میں معرکۂ کارزار گرم ہوا تو لوگوں کی جان و مال غیر محفوظ ہوگئی۔ اکثر ہنرمند شہر چھوڑ کر جائے امن کی تلاش میں ادھر اُدھر بکھر گئے۔ کچھ اپنے گھروں میں پناہ گزیں رہے۔ فنکاروں اور ہنرمندوں کو ایسے مصائب سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ فقر و فاقہ ان کا مقدر بن گیا۔ عرصہ تک موت و زیست کی کشمکش میں شب و روز گزارے۔ یہ سلسلہ کم و بیش ۱۸۵۸ء کے آغاز تک قائم رہا۔ اس کے بعد جب امن و امان قائم ہوا تو دوسرے فنکاروں کی طرح خطاط و خوشنویس بھی تلاش معاش کی فکر میں سرگرداں ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں لکھنؤ کے بیشتر مطابع برباد ہو چکے تھے جو ان کی امیدوں کا سہارا تھے۔ ایسے پُر آشوب دور میں اچانک ایک شمع علم و ہنر روشن ہوئی جس کی روشنی میں ناامید اور مایوس فنکاروں نے اپنے مستقبل کو پُر امید پایا۔ اور ان کی امیدوں کا مرکز تھا مطبع منشی نولکشور جس کا قیام ۱۸۵۸ء کے وسط میں عمل میں آیا۔ اور ماہ نومبر ۱۸۵۸ء میں اس مطبع سے اودھ اخبار جاری ہوا۔

۱؎ نصیر الدین حیدر کے عہد سے واجد علی شاہ کی معزولی تک لکھنؤ میں بہت سے مطابع ہو گئے تھے۔ ان کے نام درج ذیل ہیں۔ جولائی ۱۸ء

باب پنجم

مطبع نولکشور اور کتابت کا فروغ

۱۸۵۸ء میں مطبع نولکشور کا قیام عمل میں آیا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ اس وقت منشی نولکشور کی عمر تیئیس[۲۳] سال تھی۔ انہوں نے آغاز شباب میں اخبار کوہ نور لاہور میں کام کیا تھا۔ جہاں صحافت کے علاوہ طباعت و اشاعت کے فن میں بھی مہارت حاصل کی۔ ان کو سب سے زیادہ فکر اپنا اخبار جاری کرنے کی تھی، ان کے دل میں ملک و قوم کی خدمت کا بے پناہ جذبہ تھا۔ اسی کے ساتھ تجارت بھی مقصود تھی۔ انہوں نے اپنی عملی سرگرمیوں کے لئے اودھ کی راجدھانی لکھنؤ کا انتخاب کیا۔ جو صدیوں سے علوم و فنون کا مرکز تھا۔ لکھنؤ آنے کے بعد انہوں نے وسط شہر کے محلّہ رکاب گنج میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ ایک ہینڈ پریس خریدا۔ اور چھوٹی چھوٹی کتابوں کی طباعت شروع کر دی۔ جو زیادہ بچوں کے نصاب کی تھیں۔ ابتدا میں دو تین کاتبوں سے کام لیا۔ اس کے بعد جیسے جیسے کام بڑھا۔ کارکنوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ ہینڈ پریسوں کی تعداد بھی بڑھی۔ مختصر مدت میں اچھی خاصی ترقی ہوئی۔ انگریزی حکام بھی ان پر مہربان تھے۔ سرکاری دفاتر سے طباعت کا کام ملنے لگا جو سب اردو ہی میں ہوتا تھا۔ اس دوران منشی نولکشور نے عہد شاہی کے ان بزرگ خوشنویسوں کی خدمات حاصل کیں جو اپنی مہارتِ فن کے باعث مشہور و مقبول تھے۔ اور نہایت تجربہ کار تھے۔ ان کو پورے عزت و احترام سے مطبع میں جگہ دی۔ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا اور ان کی راحت رسانی پر توجہ کی۔ ان ماہرِ فن اساتذہ کی نگرانی میں نئے کاتبوں اور خوشنویسوں کی تربیت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ تاکہ کتابت کا سلسلہ بڑھے اور مستقبل کے لئے اچھے لکھنے والے تیار ہو سکیں۔ منشی نولکشور نے اپنے مطبع کی کشادہ عمارت میں باقاعدہ دارالکتابت قائم کر دیا۔ اور اس میں کتابت کا تمام ضروری سامان مہیا کرنے کا انتظام کیا۔ کتابت کا مخصوص کاغذ (مسطر رنگین)، تیار کرنے اور روشنائی بنانے کے لئے ماہر کاریگر موجود تھے۔ اسی طرح دوسری چیزیں تیار کرنے اور باہر سے فراہم کرنے کا

خاص انتظام تھا۔ یہ سب دار الکتابت سے ملحق عمارت میں رکھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ کتابت کا اتنا سامان تیار ہونے لگا کہ اپنی خوبیوں کے باعث ملک کے دوسرے مطابع کی فرمایشیں بھی پوری کی جاتی تھیں۔ اس صیغہ کا نگران کوئی ماہر خوشنویس مقرر کیا جاتا تھا۔ منشی نولکشور کی زندگی میں اس منصب پر منشی نثار حسین، مولوی ہادی علی، مولوی محمد اسمٰعیل، مولوی حامد علی، منشی اشرف علی جیسے بلند پایہ فنکار فائز رہے۔ انہیں کے زیر سایہ نئے کاتبوں کی تربیت ہوئی اور یہ سلسلہ بڑھتا رہا جس میں منشی شمس الدین اعجاز رقم، منشی ابن حسن، میر حشمت علی جیسے ماہر خطاط و خوشنویس شامل ہیں۔

مطبع نولکشور کے دار الکتابت سے وابستہ کاتبوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ اور جو مطبع کے باہر اپنے گھروں پر کام کرتے تھے ان کی تعداد بھی بہت تھی۔ منشی نولکشور کی وفات (فروری ۱۸۹۵ء) کے بعد بھی یہ سلسلہ قائم رہا۔ ان کے تیسرے جانشین کے عہد ۱۹۵۰ء میں مطبع دو حصوں میں تقسیم ہو گیا[1] جس کی وجہ سے اس عظیم مطبع کو زوال سے ہمکنار ہونا پڑا اور اس کی بہت سی اہم خصوصیات کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۹۵۰ء تک جن خوشنویس اور کاتبوں نے اس مطبع میں کام کیا ان کی تعداد کا احاطہ کرنا بہت دشوار ہے۔ تاہم اس کے لئے جد و جہد جاری رہے گی۔ جو حالات فراہم ہو سکے وہ اس تذکرے میں شامل ہیں۔

---

[1] منشی نولکشور (متوفی ۱۸۹۵ء) کی وفات کے بعد ان کے متبنیٰ بیٹے منشی پراگ نرائن جانشین ہوئے۔ یہ ان کے حقیقی بھتیجے تھے۔ ان کے عہد میں مطبع نے بہت ترقی کی، ان کی وفات (۱۹۳۱ء) کے بعد ان کے اکلوتے بیٹے منشی بشن نرائن مطبع کے وارث ہوئے، لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی نوجوانی میں وفات پائی، ان کے دو بیٹے تھے۔ منشی رام کمار اور منشی تیج کمار۔ ان دونوں میں سے بعض خود غرض اعزا نے شدید اختلافات پیدا کر دیے جس کے نتیجے میں ۱۹۵۰ء میں مطبع دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور یہ تقسیم اس کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ دونوں حصوں کا وجود اب (۱۹۸۹ء میں) برائے نام رہ گیا ہے۔

مطبع نولکشور کے خطّاط و خوشنویس

منشی امیر اللہ تسلیم تسلیم ایک ماہر خطّاط اور ممتاز خوشنویس تھے۔ ان کو کئی حیثیتوں سے شہرت حاصل ہے۔ وہ اردو کے ادیب اور خوش گو شاعر تھے۔ عربی و فارسی زبانوں میں بھی اچھی استعداد تھی۔ ان کا اردو دیوان شائع ہو چکا ہے۔

تسلیم کی ولادت ۱۸۰۸ء کو قصبہ مغلی دیا منگلسی، ضلع فیض آباد میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد مولوی شیخ عبد الصمد ایک تعلیم یافتہ بزرگ تھے۔ تسلیم نے انہیں کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ نہایت محنتی اور ذہین تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد فکر معاش میں سرگرداں ہوئے۔ اودھ کی شاہی فوج میں ملازمت اختیار کی، اس وقت ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔ یہ امجد علی شاہ کا دورِ حکومت تھا۔ خوشنویسی کا شوق بچپن سے تھا، دورانِ ملازمت بھی خالی اوقات میں مشق کرتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں مطبع مصطفائی کو لکھنؤ میں بہت شہرت حاصل تھی، عمدہ طباعت و کتابت میں بہت نیک نام تھا، تسلیم نے مالک مطبع سے اصرار پر چند وقتی طور پر کتابت کرتے تھے۔ انہوں نے فن خوشنویسی میں منشی عبد الحیٔ سندیلوی کی شاگردی اختیار کی جو مشہور و ماہر خوشنویس تھے۔[1]

۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو اس وقت اودھ پر انگریزی حکومت کی گرفت مستحکم ہو چکی تھی۔ انہوں نے شاہ اودھ پر زور ڈالا کہ وہ اپنی فوجی بٹیلین توڑ دیں۔ پہلے وہی پلٹن ختم کی گئی جس میں تسلیم ملازم تھے۔ جب وہ بیروزگاری کے باعث پریشان ہوئے تو واجد علی شاہ کے دربار میں ایک منظوم درخواست پیش کی جس میں ذریعہ معاش بند ہونے کا شکوہ کیا۔ ان کی درخواست پر بادشاہ نے یہ منظوم جواب اور حکم نامہ صادر کیا۔ ٥

---

[1] گزشتہ لکھنؤ مرتبہ شرر لکھنوی صفحہ ۱۷۲

بشنو اے خوشنویس وائے خوش گو
ہر دو فن کنی و ہر دو نکو
اسم تو مندرج بہ دفتر شد
بست و دو روپیہ مقرر شد

اس کے بعد تسلیم کو بائیس روپیہ ماہوار وظیفہ ملنے لگا۔ ساتھ ہی کتابت بھی کرتے رہے۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے واجد علی شاہ کو حکومت سے معزول کر دیا اور کلکتہ میں مٹیا برج کے علاقے میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد تسلیم کا وظیفہ بند ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ سخت پریشانی میں گزرا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں لکھنؤ کے مطابع بھی تباہ ہو گئے۔ اس لئے کاتبوں کا ذریعہ معاش بھی ختم ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۸ء کے وسط میں منشی نولکشور نے لکھنؤ میں اپنا مطبع جاری کیا اور ماہ نومبر میں اودھ اخبار نکالا۔ اس وقت ان کو اچھے خوشنویس کاتبوں کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ نہایت مردم شناس آدمی تھے تسلیم کے متعلق ان کو معلومات حاصل ہوئیں تو انہوں نے نہایت عزت و تکریم سے ان کو اپنے مطبع میں کام کرنے کے لئے رضامند کر لیا۔ منشی نولکشور ماہرین فن کے بڑے قدردان تھے، انہوں نے اپنے ایک مضمون میں تسلیم کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

خوشنویسانِ جادو نگار عمدۂ روزگار ہیں جیسے امیر اللہ
متخلص بہ تسلیم [1]

مطبع نولکشور میں تسلیم بحیثیت کاتب آئے تھے لیکن ان کی علمی لیاقت کے پیش نظر ان کے سپرد تصحیح کتب کا کام بھی کیا گیا، اور اودھ اخبار کے عملۂ ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ تسلیم نے غالب کی مشہور کتاب قاطع برہان کی دیدہ زیب کتابت کی، جسے مطبع نولکشور نے نہایت اہتمام سے طبع کیا۔ اس کی اشاعت کی اطلاع اہلِ علم کو دینا ضروری تھا۔ کئی ماہ تک اس کا اشتہار اودھ اخبار میں شائع ہوتا رہا۔[2] انہوں نے مطبع کی کئی بڑی چھوٹی کتابوں کی کتابت

---

[1] اودھ اخبار ماہ جنوری ۱۸۶۲ء مملوکہ کتب خانہ ایوان غالب دہلی۔

[2] اودھ اخبار ۲۸ ماہ جنوری ۱۸۶۳ء و ۱۱ ماہ فروری ۱۸۶۳ء

کی، ساتھ ہی صحت کا کام بھی کرتے تھے۔ حسب ضرورت اودھ اخبار کے بعض مضامین کی کتابت کر دیتے تھے۔ قاطع برہان کا پہلا اڈیشن انہیں کا کتابت کیا ہوا تھا۔ تسلیم نے شاعری میں نسیم دہلوی (شاگرد مومن) کی شاگردی اختیار کی، ان کی خوش قسمتی تھی کہ خود نسیم ان دنوں مطبع میں ملازم تھے۔ تسلیم کو ان کے ساتھ کام کرنے اور اٹھنے بیٹھنے کا موقع خوب ملتا تھا۔ انھوں نے نسیم کے دیوان پر مقدمہ بھی لکھا اور ان کی وفات پر قطعہ تاریخ کہا تھا جس پر ان کے ایک ہم عصر شاعر جواہر سنگھ جواہر نے اعتراض کیا تھا اور منشی نولکشور کو خط لکھ کر ایک غلطی کی طرف توجہ دلائی تھی اس کا جواب تسلیم نے دیا تھا جو اودھ اخبار کے شمارہ ماہ ۱۱ فروری ۱۸۶۳ء کو شائع ہوا تھا۔ اسی اشاعت میں آئندہ اس بحث کو روکنے کے لئے منشی نولکشور کی ایک مختصر تحریر شائع ہوئی تھی جو بڑی سوجھ بوجھ پر مبنی ہے، لکھتے ہیں

> ہم الطاف نامہ جواہر کے درج کرنے سے کمال خوش ہوتے ہیں۔ ہم کو بحث علمی کے اندراج سے شکایت کا کیا منصب تھا لیکن یقیناً نتیجہ بحث علمی نوبت بہ نفسانیت نہ ہو، مضائقہ نہیں۔ بمطبوع خاطر اس کی اشاعت میں احباب کی خوشی اور اس کو باعث افتخار جانتے ہیں[1]

منشی نولکشور کی اس سنجیدہ تحریر کے باعث مزید نوک جھونک کی نوبت نہ آئی، جس میں ایک دوسرے کے متعلق نازیبا تحریریں شائع کرنے کا اندیشہ تھا۔ بہرحال تسلیم نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے اور انکے حالات و کارناموں پر تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے۔

تسلیم آخر عمر تک مطبع نولکشور سے وابستہ رہے، انھوں نے چھوٹی بڑی بہت سی کتابوں کی کتابت کی ہے، نسخ اور نستعلیق دونوں میں ماہر تھے، خفی اور جلی دونوں خط اچھے تھے۔ انھوں نے اردو اور فارسی کی متعدد کتابوں پر حواشی بھی لکھے ہیں۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں ان کو بحیثیت شاعر پیش کیا ہے

[1] اودھ اخبار ۱۱ ماہ فروری ۱۸۶۳ء

اور ان کی ایک تصویر بھی شامل کی ہے۔ مرزا محمد عسکری مترجم تاریخ ادب اردو نے اپنے مرتبہ تذکرۂ شعرا میں تسلیم کے حالات بھی لکھے ہیں۔ ان کی شائع شدہ تصویر پر بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> غریب خانہ کے متصل ایک مسجد ہے جہاں تسلیم تشریف لایا کرتے تھے، والد صاحب سے بہت ملاقات تھی۔ ان کے کہنے سے ابتدائی مشق خوشنویسی مجھ سے کرائی تھی تسلیم کی تصویر جو تاریخ ادب اردو میں دی ہے، اس میں ایک ہاتھ میں لکڑی اور دوسرے میں تسبیح ہے اور سر پر پگڑی بھی ہے۔ . . . . مگر نجدا یہ شان اور لباس ان بزرگ کا ہرگز نہ تھا، ان کے ہاتھ میں اتنی بڑی تسبیح میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ وہ نہایت بے ریا سیدھے سادے مذہبی آدمی تھے۔ صورت نہایت نورانی، چھوٹی داڑھی، جیسا میں نے ان کو اس زمانے میں دیکھا[1]

تسلیم نے ۲۷ مئی ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں وفات پائی[2]

منشی آلِ حسن مطبع نولکشور کے مشہور کاتب تھے۔ لکھنؤ کے نہایت اچھے خطاط اور خوشنویس، نسخ اور نستعلیق دونوں میں مہارت تھی لیکن نستعلیق میں امتیاز حاصل تھا۔ انہوں نے علاوہ دوسری کتابوں کے کلیات شمس تبریز جیسی ضخیم کتاب نہایت دیدہ زیب نستعلیق میں لکھی تھی، جو ایک ہزار چھیالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا کچھ حصہ منشی شیو پرشاد نے لکھا ہے اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ دونوں کے خطوں میں اس قدر یکسانیت ہے کہ آسانی سے دیکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ دو ہاتھوں کی تحریر ہے صرف ماہر فنکار ہی برائے نام فرق کو پہچان سکتے ہیں۔ آلِ حسن نے اودھ اخبار کے مضامین کی کتابت بھی کی ہے۔ منشی نولکشور ان کی خدمات اور فنی مہارت کے معترف تھے۔ انکا وطن لکھنؤ ہے۔ مگر باوجود جستجو کے حالات زندگی معلوم نہ ہوسکے۔ آخر عمر تک مطبع نولکشور میں ملازم رہے۔

---

1. تذکرہ شعراء (قلمی) مملوکہ راقم الحروف صفحہ ۳۲
2. تذکرہ کاملانِ رام پور مطبوعہ خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

میر ابنِ حسن

ماہرِ فن خطّاط و خوشنویس تھے۔ انہوں نے لکھنؤ کے ممتاز اساتذہ فن سے تعلیم حاصل کی تھی۔ خطاطی کے علاوہ ان میں انتظامی صلاحیت بہت اچھی تھی، منشی نولکشور نے انہیں خوبیوں کے باعث ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ان کو کتابت کے علاوہ تصحیح کتب کا کام بھی دیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ اس شعبہ کے افسر بنا دیے گئے۔ وہ خاص طور پر اودھ اخبار کے کاتبوں کی نگرانی کرتے تھے۔ خط نستعلیق سے خاص شغف تھا۔ اودھ اخبار کے اہم مضامین کی کتابت کرتے تھے۔ منشی نولکشور نے ۱۸۷۶ء کے آغاز میں اپنے مطبع کے خاص خاص کارکنوں کے حالات پر ایک مضمون لکھا تھا[۱] اس میں ابنِ حسن کے متعلق لکھا ہے کہ:

"میر ابنِ حسن صاحب مطبع اودھ اخبار میں افسر عملۂ تصحیح و خوشنویساں مطبع تھے اب بمبئی کی ایجنسی کے گماشتۂ اول درجہ کے ہیں نہایت دیانت دار اور ان کا کام بمقابلہ جملہ ایجنسی کے کمال درجہ کی لیاقت کا ہے۔"

منشی نولکشور نے ان کی غیر معمولی انتظامی صلاحیت کے پیش نظر ان کو اودھ اخبار کا نمائندہ اور مطبع کا ایجنٹ مقرر کر کے بمبئی میں متعین کیا تھا۔ اس خدمت کو انہوں نے بخوبی انجام دیا۔ وہ اودھ اخبار کے لئے خبر رسانی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ منشی نولکشور کے ایک خاص دوست میاں داد خان سیّاح جب بمبئی گئے تو میر ابنِ حسن کے مہمان ہوئے اور ان کی خوش انتظامی سے بہت خوش ہو کر ان کی کارگزاری کی تعریف منشی نولکشور سے ایک خط کے ذریعہ کی۔ جس کا ذکر سیّاح کی تصنیف سیرِ سیاح میں موجود ہے[۲]۔ میر ابنِ حسن کے مزید حالاتِ زندگی نہیں معلوم ہو سکے، لیکن ان کا نام مطبع نولکشور کے پرانے رجسٹروں میں متعدد جگہ نظر آتا ہے۔ وہ منشی شمس الدین اعجاز رقم کے ہم عصر تھے۔ ان کے شاگردوں میں کئی اچھے خطّاط تھے۔

۱؎ اودھ اخبار شمارہ ۹ جنوری ۱۸۷۶ء بعنوان، رپورٹ سالانہ بابت کارگزاری مطبع از نولکشور، مملوکہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔

۲؎ سیرِ سیّاح، مطبوعہ انجمن اسلام بمبئی۔

مولوی محمد اسمٰعیل عہدِ نولکشور کے ممتاز خوشنویس اور خطاط تھے۔ خط نستعلیق میں مہارت حاصل تھی۔ وہ اپنی انتظامی صلاحیتوں کے باعث مطبع نولکشور کے اہم کارکنوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ کتابوں کے علاوہ اودھ اخبار کی کتابت بھی کرتے تھے۔ منشی نولکشور نے ان کو کاتبوں کا نگراں بنادیا تھا۔ مطبع کی مطبوعات کی فہرستیں ان کی نگرانی میں مرتب کی جاتی تھیں۔ فہرستوں کی کتابت کرنے والے کاتبوں کا انتخاب وہی کرتے تھے۔ بعض کتابوں کی صحت بھی کرتے تھے۔ وہ اعلےٰ تعلیم یافتہ تھے، عربی فارسی میں مہارت حاصل تھی۔ منشی نولکشور کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ اسی لئے ان کو نولکشور پریس کانپور کا ناظم عمومی بنادیا تھا۔ اس زمانے میں منشی بھگوان دیال عاقل پریس کے مینیجر تھے۔ اس زمانے کے ماہر داستان گو محمد جان مریخ کی تصنیف داستان "سامری نامہ" کی کتابت انہیں کی نگرانی میں ہوئی، جس کی صحت کتابت، مرزا فدا علی خنجرؔ کرتے تھے جو ممتاز ناول نگار تھے۔ اس داستان کی چار جلدیں مکمل ہو چکی تھیں تو اچانک کسی خاص سبب سے بقیہ جلدوں کی کتابت روک دی گئی تھی۔

مولوی اسمٰعیل کے حالاتِ زندگی معلوم نہیں ہوسکے، مطبع نولکشور میں موجود رجسٹروں اور متفرق کاغذات سے جو کچھ معلوم ہوسکا اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔ ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۰ء کے رجسٹروں میں کئی جگہ منشی نولکشور نے ان کے نام بعض احکامات و ہدایات لکھی ہیں۔ ان کی ایک تحریر کا عکس پیش کیا جارہا ہے۔ ان کی نگرانی میں ہندی مسودات کی کتابت ہوتی تھی جو ٹائپ کے بجائے لیتھو پریس پر طبع ہوتی تھیں۔ شاہ نامہ فردوسی کے ہندی ترجمہ کی پہلی جلد انہیں کی نگرانی میں طبع ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ہندی کی بیشتر کتابیں کاتب ہی لکھتے تھے۔ ٹائپ کا عام رواج کافی عرصے بعد ہوا۔ اکثر کاتب اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں کتابت کرتے تھے۔ یہ سلسلہ لکھنؤ اور کانپور دونوں جگہ جاری تھا۔

"منشی اشرف علی اشرفؔ" مشہور خطّاط، بلند مرتبہ خوشنویس، اور ماہرِ فن نسخ نگار تھے۔ ان کا شمار درجۂ اول کے کاتبوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اردو کے

علاوہ، عربی و فارسی کی اچھی استعداد تھی۔ اسلامی علوم سے بخوبی واقف تھے۔ ان کو فنِ خطاطی کا شوق طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ اس زمانے میں اس فن کے ممتاز اساتذہ میں منشی امیر اللہ تسلیم جیسے استاد کی شہرت عام تھی، اشرف علی ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہو گئے اور اس فن کی تحصیل پر پوری توجہ صرف کی۔ انہوں نے نسخ اور نستعلیق دونوں خطوں کے رموز و نکات سے واقفیت حاصل کی۔ خطِ نسخ سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔ اس میں مہارت حاصل کرنے کے لئے مسلسل مشق کا سلسلہ جاری رکھا۔ منشی نولکشور کو ایسے خوشنویسوں کی تلاش تھی، جو خطِ نسخ بہتر سے بہتر لکھ سکیں تاکہ ان سے قرآن شریف کی کتابت کرا سکیں۔ جس کا لکھنے والا عربی زبان سے واقف ہو، قرآن مجید کے متعلق ضروری معلومات بھی ہوں۔ انہوں نے اشرف علی کو مطبع میں کام کرنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ اور قرآن پاک کی کتابت ان کے سپرد کی۔ اشرف علی نے مختلف سائز کے چار یا پانچ قرآن شریف لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ ان میں مترجم اور معرّیٰ دونوں شامل ہیں۔ منشی نولکشور نے ان کے متعلق اپنے حسنِ خیالات کا اظہار کیا ہے اس کا اندازہ اس تعارف سے ہوتا ہے جو انہوں نے خود کرایا ہے۔

> منشی اشرف علی صاحب اشرفؔ۔ عربی و فارسی دونوں خطوں میں یکتا ہیں۔ قرآن کئی مرتبہ لکھے اور چھپے۔ فی الحال جلی قلم کا قرآن عبدالقادر کے ترجمے کا تحریر کرتے ہیں جو مطبع کانپور میں چھپتا ہے۔[1]

منشی اشرف علی کے لکھے ہوئے قرآن شریف کے چسپاں پتھر طباعت کے بعد محفوظ کر دیئے جاتے تھے۔ اور دوبارہ انہیں پر نیا ایڈیشن طبع ہوتا تھا۔ ان کا خط نہایت خوشنما، صاف اور پڑھنے میں آسان ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونے والے یہ قرآن شریف اب تک اپنی نمایاں خصوصیات کے باعث مقبول ہیں، انہیں کی نقل ملک کے دوسرے مطابع نے بھی طبع کرائی۔ نولکشور پریس میں جتنے قرآن شریف طبع ہوئے ان میں بیشتر کی کتابت مولوی ہادی علی اور منشی اشرف علی نے کی ہے۔ ان کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ منشی نولکشور کے ابتدائی عہد سے سنہ ۱۹۴۲ء تک نہایت خوش اسلوبی سے جاری رہا۔ اور سنہ ۱۹۵۰ء سے بالکل ختم ہو گیا۔

---

[1] اودھ اخبار مورخہ ۹ جنوری سنہ ۱۸۷۲ء۔

منشی اشرف علی کو نستعلیق نویسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ انہوں نے جو مترجم قرآن شریف لکھے ہیں ان میں اردو ترجمہ خط نستعلیق میں ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے عربی قاعدے سی پارے اور پنج سورے بھی لکھے ہیں۔ ان کی کتابت کی صحت بھی خود کرتے تھے۔ وہ آخر عمر تک مطبع نولکشور کے شعبۂ کتابت سے منسلک رہے۔ اشرف علی نے خط نسخ میں علامہ فیضی کی مشہور تفسیر قرآن سواطع الالہام لکھی جو ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ ان کے لکھے ہوئے حسب ذیل قرآن مجید لاکھوں کی تعداد میں طبع ہوئے۔

۱۔ قرآن مجید جلی قلم پنج مہری دلیتی پانچ عالموں نے اس کی صحت کی تصدیق تحریری طور پر کی ہے۔
۲۔ قرآن مجید مترجم مع تفسیری حواشی
۳۔ قرآن مجید متوسط قلم
۴۔ قرآن مجید جلی قلم مترجم
۵۔ قرآن مجید ۱۳ سطر
۶۔ حمائل متوسط
۷۔ حمائل خُرد۔

یہ قرآن مجید سینکڑوں تجربوں پر چسپیدہ رہے اور ۱۹۵۰ء تک کم وبیش طبع ہوتے رہے صرف نمبر ۱ اور نمبر ۲ کم طبع ہوئے۔

منشی امیر علی نقاش ماہر فن خوشنویس اور بلند پایہ نقاش تھے۔ مطبع نولکشور کی قدیم مطبوعات کے سر ورق ان کی نقاشی کے نہایت دلکش و دیدہ زیب نمونے ہیں اور ان پر لکھے ہوئے کتابوں اور مطبع کے نام خط نستعلیق میں ان کی مہارت فن کے شاہد ہیں۔ امیر علی، مطبع نولکشور کے ابتدائی دور میں اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ منشی نولکشور کی دوربین نگاہوں نے ان کی فنی مہارت سے واقف ہونے کے بعد انہیں اپنے مطبع میں کام کرنے کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ وہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور نہایت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے لکھے ہوئے خط گلزار کے قطعات اور نام لوگ آرائش کے لئے اپنے مکانوں میں آویزاں کرتے تھے۔ مطبع نولکشور سے شائع ہونے والی کتابوں کے سر ورق تیار کرنا ان کے سپرد تھا۔ منشی نولکشور نے

ان کو "یادگارِ مانی بہزاد" کے خطاب سے نوازا تھا۔ انہوں نے سنہ ۱۸۷۲ء کے آغاز میں اپنے مطبع کے چند کارکنوں کا ذکر اپنی سالانہ رپورٹ میں کیا ہے۔ اس میں منشی امیر علی کے متعلق لکھا ہے کہ:

> امیر علی نقاش یہ قدیم خدمت گزار اس مطبع کے یادگارِ مانی بہزاد ہیں۔ ان کے بھائی قائم علی مصوّر ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے مطبع کی روشنائی سے جو کام بنائے، ہم نے کہیں دیکھا نہیں بتقریب یوم کلاں (بڑا دن) جو تحائف، وصلیاں و قطعات و نقش و نگار کے قطعے پیش ہوئے حکام نے ان کو نہایت تعریف کے ساتھ سراہا جس قدر لوح و تصاویر اور نقاشی و مصوّری کے کام نمائش گاہ لندن میں بڑی محنت سے کام کیا۔[1]

مذکورہ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منشی نولکشور امیر علی اور ان کے بھائی قائم علی کے فن سے کس قدر متاثر تھے۔ ماہ مئی سنہ ۱۸۷۲ء کو لندن میں ایک بڑی نمائش ہوئی تھی۔ منشی نولکشور نے اپنے مطبع کی طرف سے اس نمائش کے لئے کتبات، قطعات اور وصلیاں بھی تیار کرا کے ارسال کی تھیں جو اعلیٰ نقش و نگار اور بارہ مختلف رنگوں سے مزیّن تھیں۔ نستعلیق اور نسخ کی تحریر اور طغرے ماہر خوشنویسوں نے لکھے تھے اور نقش نگار و بیل بوٹے شیخ امیر علی اور ان کے بھائی قائم علی نے بنائے تھے۔ اس کے علاوہ جو کتابیں نمائش میں رکھی گئی تھیں ان کے سرورق بھی انہیں ماہر فنکاروں نے تیار کئے تھے۔ بعض کتابیں مصوّر تھیں اور تصاویر بھی کتابت کے طریقے پر اسی کاغذ اور روشنائی سے بنا کر پتھروں پر چسپاں کی گئیں اور ان کی طباعت عمل میں آئی، جن کو قدیم مطبوعات نولکشور میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لندن کی نمائش کے متعلق منشی نولکشور نے خود اپنی مرتب کی ہوئی سالانہ روداد میں لکھا ہے کہ:

> جو جو عمدہ کتاب اور نمونہ جات چھاپہ پتھر اور کارخانہ ٹیپ کے یہاں

---

[1] رپورٹ سالانہ متعلق کارگزاری مطبع نولکشور بابت سنہ ۱۸۷۲ء بقلم منشی نولکشور مطبوعہ اودھ اخبار شمارہ ۹ ماہ جنوری سنہ ۱۸۷۲ء ماخوذ از فائل اودھ اخبار مملوکہ خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

چھپے اور چھپتے ہیں تو اس صنعت کا کمال خاص مد نظر رہا ہے. خدا کی
شان جلوہ دکھا رہی ہے. بہار آ رہی ہے۔ اسی سال نمائش گاہ لندن جو
ماہ مئی ۱۸۷۲ء میں ہونے والا ہے. حسب الایمائے جناب خداوند
نعمت مسٹر کالن بردننگ صاحب ایم۔ اے۔ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن
ملک اودھ جو نمونہ جات مختلف رنگ کے روانہ ہوئے' وہ نکات
اور باریکیاں۔۔۔ بادی النظر میں نہیں آئیں' پانچ رنگ تک کے
پھول پتے سونے کا چھپا ہوا' اپنی اپنی جگہ پر ہر ایک رنگ کی خوشنمائی
گویا ہاتھ کا کام قدرتی تھا عجیب معلوم ہوتی تھی۔ یہ اس نمائش گاہ
کے لئے قریب بارہ قسم کی مختلف روشنائی نکالی گئی• سبحان اللہ! اس
عمدہ صنعت کو جیسا کہ راقم نے اس مطبع عالیشان میں جلوہ دکھایا
اینکہ۔۔۔ اور مختلف شہروں میں زمانہ اسی شغل میں بسر کیا مگر
ایسا کام نہ دیکھا۔ ابھی دو روز کا مذکور ہے کہ ۵ منٹ میں کاپی لکھی
گئی اور پتھر گرم ہوا اور پروف حاصل ہوا۔ کام کے اندر یہ عجلت
ماشاء اللہ' چشم بد دور[1]

لندن کی نمائش میں مطبع کو بطور انعام سونے کا تمغہ اور ایک سند عطا کی گئی۔ امیر علی آخر عمر تک مطبع سے وابستہ رہے۔ ان کی مہارت فن کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ مولوی محسن علی ساقی شاگرد ناسخ نے منشی نولکشور اور کارکنان مطبع کا ذکر ایک مختصر مثنوی میں کیا ہے جو مادرت بہا کا میں بطور تقریظ شامل ہے۔ اس میں منشی امیر علی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

اور اک دوسرے ہیں امیر علی — اور ان کا وہ بیٹا وزیر علی
غضب کے یہ نقاش ہیں تیز دست — لکھیں آپ پر شکل بالا و پست
جو تحریر کی جان پیدا ہوئی — جو تصویر کھینچی وہ گویا ہوئی

منشی محمد افضل حسین

منشی شمس الدین اعجاز رقم کو اپنے جن ارشد تلامذہ پر ناز تھا' ان میں منشی محمد افضل کا نام سر فہرست ہے۔

---

[1] اودھ اخبار مورخہ ۹ جنوری ۱۸۷۲ء صفحہ ۳۴ فائل اودھ اخبار ۱۸۷۲ء مملوکہ خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

وہ فنِ خطاطی اور خوشنویسی میں اپنی مہارتِ فن کے باعث بہت مشہور ہیں۔ وہ صاحبِ علم و دانش تھے۔ فارسی، اردو، دونوں زبانوں کے ادب میں ماہر اور عربی زبان سے واقف تھے۔ خوشنویسی کا ذوق و شوق بچپن سے تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد زیادہ وقت خوشنویسی میں صرف کرتے تھے، اور استاد کی خدمت میں حاضری روزانہ کا معمول تھا۔ ان کا تعلق ایک معزز خاندان سے ہے جو زیادہ خوشحال نہ تھا۔ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کو خطِ نسخ اور نستعلیق کے علاوہ آرائشی تحریروں سے بھی دلچسپی تھی۔ انہوں نے بہت عرصہ تک مطبع نولکشور میں مسودات کی کتابت کی۔ اردو فارسی کے علاوہ عربی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ کتابوں کے سرورق پر جلی قلم سے نام بہت خوشنما لکھتے تھے۔ نقش و نگار بھی بہت دلکش بنائے ہیں۔ انہوں نے مطبع نولکشور میں ملازمت نہیں کی، طے شدہ اجرت پر کام کرتے تھے۔ آخر عمر میں اپنے ذاتی حالات کے باعث پریشان رہے۔ راقم الحروف نے ان کا آخری زمانہ دیکھا ہے، جب وہ پیرانہ سالی کے باوجود محترم تاج الدین عشرت سے ملاقات کے لئے ان کے مکان پر آتے تھے۔ دراز قد، خوش رو اور جامہ زیب شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی عمر کا آخری زمانہ محلہ کھالہ بازار کی مسجد میں گزرا، جو ان کے مکان کے قریب تھی۔ ایک دن اچانک مسجد کے اس حجرے کی چھت گر گئی جس میں وہ آرام فرما تھے۔ اس حادثہ میں زخمی ہو کر وفات پائی۔ یہ واقعہ ۱۹۵۴-۵۵ء میں پیش آیا، اس وقت ان کی عمر تقریباً نوے سال تھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ راقم الحروف نے اس مسجد کے آس پاس رہنے والے لوگوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ پیشِ نظر معلومات ان کے دو شاگردوں سے حاصل ہوئیں۔ منشی محمد افضل لاولد تھے۔ ان کے شاگردوں میں بعض نامور اور ماہر کاتب بقیدِ حیات ہیں جن کا ذکر اس تذکرے میں شامل ہے۔

مولوی سید انوار احمد لکھنؤ کے ایک معزز خاندانِ سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ فنِ خطاطی اور خوشنویسی میں ان کی مہارت مسلّم ہے۔ ان کے والد ماجد مولوی سید احمد ماہر فنِ خطاط و خوشنویس ہونے کے علاوہ بہت ذی علم شخصیت کے حامل تھے۔ انہیں منشی امیر اللہ تسلیم اور منشی ہادی علی کے ہم عصر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ لیکن یہ تصدیق نہ ہو سکی کہ کس کے شاگردِ رشید تھے۔ مولوی

انوار احمد نے بچپن سے ہی اپنے والد سے خوشنویسی کی تعلیم حاصل کی، اس دور کی مروجہ تعلیم کی تحصیل کے ساتھ، تحریر کی مشق جاری رکھی، سنِ شعور کو پہنچے تو کتابت کو ذریعہ معاش بنایا۔ اپنے والد کے بعد انہوں نے منشی شمس الدین اعجاز رقم کی شاگردی اختیار کی اور خط نسخ اور نستعلیق میں دونوں میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ مطبع نولکشور میں ان کے والد کتابت کرتے تھے۔ انوار احمد نے بھی مطبع نولکشور کا رخ کیا جہاں کام کی کمی نہ تھی۔ باقاعدہ سلسلہ ملازمت میں شامل نہیں ہوئے لیکن زندگی کے بیشتر حصے میں اسی مطبع کا کام کرتے رہے۔ انہوں نے چار یا پانچ قرآن مجید لکھے۔ اس کے علاوہ خط نستعلیق میں اردو فارسی کے دواوین اور کلیات کی کتابت کی۔ مذہبی کتابوں میں مظاہر حق شرح مشکوٰۃ کی پانچ جلدوں میں نصف کی کتابت انہوں نے کی۔ ہر جلد بہت بڑے سائز کے سات آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ حدیث کی مشہور فارسی کتاب "اشعۃ اللمعات" لکھی جو چار ضخیم جلدوں میں ہے۔ نہایت محنتی، ایماندار اور رمرنجان مرنج انسان تھے۔ اعجاز رقم کے شاگردوں کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ انوار احمد اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی تھے۔ انہوں نے اپنے رکھ رکھاؤ سے اس فن کی آبرو بڑھائی۔ لکھنؤ میں مولوی انوار احمد اپنے آبائی مکان میں رہتے تھے جو محلہ جتیا باغ، نزد راجہ بازار میں واقع ہے۔ وہیں طویل علالت کے بعد ۱۹۷۱ء میں وفات پائی۔ ان کے دو بیٹوں نے، باپ کا فن وراثت میں پایا اور اس کو آج تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ بڑے بیٹے نثار احمد اور چھوٹے انصار احمد، اچھے خوشنویس ہیں اور دونوں کتابت کے فن سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ اور اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر رواں دواں ہیں۔

مولوی انوار احمد کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی کتبہ یا قطع دستیاب نہ ہوسکا۔ ان کی لکھی ہوئی مطبوعہ کتابوں سے ان کی خوبیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ چند کتابوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ ایک عکسِ تحریر پیشِ نظر تذکرے میں شامل ہے۔

منشی محمد باقر علی ہمسر ہمسر منشی شمس الدین اعجاز رقم کے شاگرد رشید تھے۔ فن خطاطی و خوشنویسی میں ماہر تھے۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ فارسی اردو دونوں زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ بچپن سے خوشنویسی کا شوق تھا۔ منشی شمس الدین اعجاز رقم سے شرف

تلمذ حاصل کیا اور استاد کے خط سے خط ملانے کی کوشش میں لگے رہے۔ سن شعور کو پہنچے تو مطبع نولکشور سے وابستہ ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب منشی شمس الدین مطبع میں کتابت کرتے تھے اور مولانا عبد العلی آسی[1] مدراسی صحت کتابت پر مامور تھے۔ جب منشی شمس الدین نے گلستان با تصویر کی کتابت کی اور اس کی اشاعت عمل میں آئی تو مولانا آسی مدراسی نے اس پر فارسی میں طویل تقریظ لکھی۔ اور منشی باقر علی ہمسر نے قطعۂ تاریخ طباعت فارسی میں تحریر کیا جو کتاب کے پہلے اڈیشن میں شامل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو اپنے استاد سے کس درجہ محبت و عقیدت تھی۔ ہمسر نے مطبع میں فارسی اور اردو کی بہت کتابیں لکھیں۔ خط نستعلیق میں ان کو بہت مہارت حاصل تھی۔ نسخ بھی اچھا لکھتے تھے۔

ہمسر کو شعر و شاعری میں بھی ملکہ حاصل تھا لکھنؤ کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ ان کے ہم عصر ساتھیوں میں واجد علی شیریں رقم بھی تھے جن کو منشی شمس الدین کی شاگردی پر بہت ناز تھا۔

منشی برج لال

مطبع نولکشور کے اچھے کاتبوں میں تھے' اردو ہندی دونوں رسم الخطوں میں کتابت کرتے تھے۔ انہوں نے اردو کی چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مطبع کی فہرست کتب لکھنے والے کاتبوں میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ مالک مطبع کے رجسٹر احکامات میں ایک جگہ منشی نولکشور کی ایک تحریر ہے کہ جدید فہرست کتب عباس علی اور برج لال مل کر لکھیں۔ اس دور میں کتابوں کی چھوٹی بڑی فہرستیں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ منشی نولکشور کے حکم سے اندازہ ہوتا ہے کہ برج لال کا شمار مطبع کے

---

[1] مولانا عبد العلی آسی مدراسی۔ مطبع نولکشور میں ملازم تھے۔ اور صحت کتابت اور مسودات پر نظر ثانی کرتے تھے۔ بہت ماہر فن عالم تھے۔ مطبع میں رہ کر جو تجربہ ہوا۔ اسکی بنا پر انہوں نے اصح المطابع کے نام سے محلہ محمود نگر میں اپنا مطبع جاری کیا۔ اور مدراس عربی کی نصابی کتب طبع کیں۔ ایک عربی رسالہ البیان جاری کیا۔ ان کے تین بیٹوں میں دو بہت مشہور عالم و فاضل تھے۔ بڑے شمس العلماء عبد الغنی پروفیسر ناگپور یونیورسٹی اور ان سے چھوٹے پروفیسر عبد التواب ثانی لکھنؤ یونیورسٹی۔ دونوں صاحب تصانیف تھے۔

اچھے کاتبوں میں کیا جاتا تھا۔ ہندی کی کتب کی فہرستیں لکھی ہیں جو لیتھو پریس میں طبع ہوتی تھیں۔ کیونکہ اس وقت ٹائپ کی طباعت کا سکشن زیادہ وسیع نہ تھا۔ اس کے علاوہ لیتھو گرافی سے طریقہ طباعت میں وقت کم صرف ہوتا اور اخراجات بھی کم ہوتے تھے۔ اسی لئے مطبع نولکشور میں ہندی کی سینکڑوں کتابیں اسی طریقہ پر طبع ہوتی تھیں۔

پیارے لال کلاں خط نستعلیق میں بہت ماہر تھے۔ مطبع نولکشور میں کتابت کرتے تھے۔ اودھ اخبار کے مضامین اور تبصروں کی کتابت بھی حسب ضرورت کر دیتے تھے۔ دیگر کتابوں کے علاوہ انہوں نے شرح دیوان عرفی شیرازی کی نہایت اچھی کتابت کی تھی جو ۱۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کے مصنف مولوی قطب الدین فارغ دہلوی اور مترجم مولوی ابوالحسن فرید آبادی ہیں۔ یہ شرح ۱۸۸۶ء میں مطبع نے شائع کی تھی۔ پیارے لال لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور اپنے عہد کے اساتذہ فن سے خطاطی و خوشنویسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔

منشی تلک رام ہوش مطبع نولکشور کے خوشنویسوں اور کاتبوں میں مہارت فن کے باعث بہت مشہور و مقبول تھے۔ خط نستعلیق بہت اچھا لکھتے تھے۔ مطبع کے ابتدائی دور میں منشی امیر اللہ تسلیم جیسے ماہر فن استاد کی شاگردی اختیار کی اور قلیل مدت میں مسلسل مشق کر کے اچھے خوشنویسوں میں شمار ہونے لگے اور اس کے بعد مطبع سے وابستہ ہوگئے۔ پہلے اودھ اخبار لکھنے پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد مطبع کے مسودات کی کتابت بھی کی۔ تعلیم و تربیت اچھی پائی تھی۔ فارسی زبان خوب جانتے تھے، لکھنؤ کی ادبی فضا نے شعر و شاعری کا ذوق و شوق پیدا کر دیا تھا۔ ہوش تخلص اختیار کیا۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے ایک کائستھ خاندان سے تھا۔ لکھنؤ کے اکثر کائستھ خاندان علوم و فنون کی خدمت میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ خوشنویسی کے فروغ میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

منشی جلال شاہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ فن خطاطی و خوشنویسی میں ماہر تھے۔ اسی کے ساتھ ان میں انتظامی صلاحیت غیر معمولی تھی۔ مطبع نولکشور میں ان کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ خط نسخ و نستعلیق میں مہارت رکھتے تھے۔

---

۱ رجسٹر احکامات مالک مطبع بابت ۱۸۸۹ء صفحہ ۴۷۔ موجود محافظ خانہ مطبع نولکشور۔

عرصے تک مسودات کی کتابت کرتے رہے۔ اس کے بعد ان کی انتظامی صلاحیت کے پیش نظر منشی نولکشور نے سنہ ۱۸۹۹ء میں ان کو دارالکتابت کا نگران مقرر کر دیا۔ اس سال اور سنہ ۱۹۰۰ء کے رجسٹر احکامات میں ان کا نام کئی جگہ ملتا ہے۔ منشی نولکشور کے بعض احکامات و ہدایات بھی ان کے نام ملتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں ان کو بعض دوسرے کاموں کا ذمہ دار بھی بنایا گیا تھا۔ ان کے تفصیلی حالات کوشش کے باوجود حاصل نہ ہو سکے۔[1]

منشی چھیدی لال بڑے ماہر خطاط اور خوشنویس تھے۔ خط نستعلیق لکھنے میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ مصوری میں بھی ملکہ تھا۔ تصاویر اور نقش و نگار خوشنما اور دیدہ زیب بناتے تھے۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے ایک ذی علم کائستھ خاندان سے تھا۔ اپنے علم و فن کے باعث علمی حلقوں میں متعارف تھے۔ مشہور صحافی اور ادیب منشی نوبت رائے نظر کے استاد تھے۔ مطبع نولکشور سے خاص تعلق تھا۔ کتابت بھی کرتے تھے اور کتابوں کے سرورق کے نمونے بھی بناتے تھے۔ اردو کے علاوہ ہندی کتابوں کی کتابت بھی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے خاندان کے بچوں کو تعلیم دلانے پر بہت توجہ صرف کی۔ خطاطی و خوشنویسی اور مصوری اپنے شاگردوں کو پوری توجہ سے سکھائی۔ ان کے کئی شاگرد مطبع نولکشور میں خوشنویسی اور کتابت پر مقرر ہوئے۔ منشی چھیدی لال نے بمقام لکھنؤ سنہ ۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔

منشی چمن لال منشی شمس الدین اعجاز رقم کے شاگرد اور بڑے ماہر خطاط و خوشنویس تھے۔ لکھنؤ کے ایک ذی علم کائستھ خاندان سے تعلق تھا۔ اردو فارسی کے علاوہ حسب ضرورت ہندی میں بھی کتابت کرتے تھے۔ نستعلیق لکھنے میں ماہر تھے، استاد کی پیروی کی کوشش میں لگے رہتے۔ اور ان سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے اعجاز رقم کے حسنِ تحریر پر قطعے بھی لکھے ہیں۔ مطبع نولکشور سے وابستہ تھے اور بہت عرصے تک کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ مطبع کے رجسٹر احکامات و ہدایات بابت سنہ ۱۹۰۸-۹ء میں کئی مقامات پر فہرست کتب لکھنے کے سلسلے میں ان کا نام نظر آیا۔ ان کا مختصر حال منشی شمس الدین کے حالات معلوم کرنے کے دوران انکے بعض شاگردوں سے معلوم ہوا۔

---

[1] ان کے متعلق معلومات رجسٹر احکامات بابت سنہ ۱۸۹۹ء سے حاصل ہوئیں۔

مرزا محمد جوادؔ لکھنؤ کے مشہور و معروف خوشنویس، خط نسخ میں ان کی مہارت کی شہرت ہندوستان کے علاوہ عراق و ایران تک پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے نستعلیق کی طرف کم توجہ کی حالانکہ وہ اچھے نستعلیق نگار تھے۔

مرزا جوادؔ ۹۴-۱۸۹۳ء کے درمیان لکھنؤ میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ خوشنویسی کی تحصیل کے لئے اس دور کے ماہر فن استاد منشی شمس الدین کی شاگردی اختیار کی۔ کتابت کو ذریعۂ معاش بنایا، لیکن کچھ عرصے بعد نظامی پریس کے نام سے محلّہ پاٹا نالہ میں اپنا مطبع قائم کیا۔ جو بعد میں خطِ نسخ میں لکھی ہوئی کتابوں کی طباعت کے لئے بہت مشہور ہوا۔ وہ اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں اپنے مطبع میں طبع کراتے تھے۔ انہوں نے قرآن کی کتابت بھی کی اور اپنے مطبع نظامی میں طبع کرایا جو بہت مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ کئی مذہبی اور علمی ادبی کتابیں لکھیں۔ حضرت علیؓ سے منسوب مشہور کتاب نہج البلاغہ لکھ کر طبع کرائی۔ مطبع کے آخری دور میں "نقد الشعر (عربی) مع اردو ترجمہ لکھی۔ مولانا سید علی نقی کی بعض تصانیف کی کتابت کی جن میں "المتحفُ العربی" خط نسخ کا خوبصورت نمونہ ہے۔ ان کے شاگردوں میں بعض بہت اچھے ماہر خوشنویس و خطاط مشہور ہوئے ہیں ان میں منشی محمد نواب بھی تھے جو خط نسخ و نستعلیق میں ممتاز تھے اور انہوں نے آخر دم تک مطبع نولکشور میں کام کیا۔ کئی شاگرد بقید حیات ہیں جن میں سید نجم الحسن خط نسخ و نستعلیق کے علاوہ ثلث میں بھی مہارت رکھتے ہیں[1]۔ مرزا محمد جوادؔ نے نجف اشرف میں ۱۹۵۷ء کو وفات پائی جہاں زیارت کے لئے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

حامد علی مرصع رقم بلند پایہ خطاط، ماہر خوشنویس۔ نسخ لکھنے میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ منشی شمس الدین اعجاز رقم کے ارشد تلامذہ میں شامل ہیں۔ وہ ماہر فن کاپی نویس تھے۔ منشی نولکشور ان کا بہت احترام کرتے۔ عربی فارسی کی تعلیم حاصل کر چکے تو خوشنویسی پر توجہ کی، اعجاز رقم کی شاگردی میں عرصے تک نسخ و نستعلیق دونوں کی مشق جاری رکھی۔ اس کے بعد مطبع نولکشور سے

---

[1] مرزا محمد جوادؔ کو راقم الحروف نے دیکھا ہے۔ ان کے مذکورہ حالات ان کے داماد سید نجم الحسن خوشنویس مالک نظامی پریس لکھنؤ سے معلوم کئے ہیں۔

وابستہ ہو گئے جہاں ان کے استاد بھی کتابت کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ اس سے قبل مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے تھے اور طلبا کو خوشنویسی سکھاتے تھے۔ خود ان کے استاد بھی مدرسہ میں جز وقتی استاد کی حیثیت سے خوشنویسی کی تعلیم دیتے تھے۔ جب مطبع نولکشور میں کام شروع کیا تب بھی مدرسہ کے لئے کچھ وقت دیتے رہے۔

حامد علی لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ان کا تعلق ایک مشہور بزرگ حضرت محمد علی شاہ کے خاندان سے تھا، جن کا مزار محلہ رسی بٹاں لکھنؤ میں مرجع عام و خاص ہے۔ ان کے حالات زندگی تفصیل سے معلوم نہ ہو سکے۔ مطبع نولکشور کے قدیم کاغذات کے مطالعے سے ان کے فنی کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے عربی اور فارسی کے متعدد مسودات کی کتابت کی۔ نستعلیق بھی بہت اچھا لکھتے تھے۔ لیکن ان کا قابل قدر کارنامہ قرآن مجید کی کتابت ہے۔ انہوں نے مطبع نولکشور کے لئے مختلف تقطیع کے کئی قرآن مجید لکھے جو بہت مقبول ہوئے، اور مدتوں طبع ہوتے رہے۔ انہیں کی نقل دوسرے مطابع نے کی۔ نولکشور پریس کی فہرست کلاں سے قرآن شریف کے حسب ذیل مطبوعہ نسخوں کی تفصیل معلوم ہوئی۔

۱۔ قرآن شریف نقل نظامی ۲۔ قرآن مجید واضح قلم ۳۔ قرآن مجید مثل نظامی مترجم ۴۔ حمائل شریف متوسط قلم۔

ان کے لکھے ہوئے قرآن مجید پتھروں پر چسپاں رکھے جاتے تھے تاکہ انہیں پر آئندہ طبع ہوتے رہیں۔ خط نستعلیق میں بھی حامد علی نے کئی کتابیں لکھی ہیں جس میں الف لیلہ و لیلہ کے چار حصے بھی شامل ہیں۔ ان کی تاریخ وسن وفات معلوم نہ ہو سکا۔

(میر) حشمت علی ماہر خوشنویس اور یگانۂ روزگار معکوس نگار تھے۔ پتھر پر الٹا لکھنے میں مہارت حاصل تھی۔ جب کسی کتابت کی ہوئی کتاب کی کاپی پتھر پر چسپاں کی جاتی تھی تو اتفاق سے اگر کوئی حرف یا لفظ خراب ہو جاتا یا نمایاں نہ ہوتا تو اس کو الٹا لکھ دیتے تھے اور اس خوبی سے کہ خط سے خط مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ پورے صفحات پتھر پر لکھتے تھے۔ مصلح سنگ کی حیثیت سے مطبع نولکشور میں ان کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ اس فن کو جاننے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ حشمت علی نے دوسرے متعدد خوشنویسوں کو اس کی عملی مشق [illegible] اور

توجہ کی بدولت اصلاح سنگ کے اس فن نے ترقی کی، اور مطبع نولکشور میں حسب ضرورت اس کے ماہرین میں اضافہ ہوتا رہا۔ میر صاحب کے متعلق منشی نولکشور نے لکھا ہے کہ:

میر حشمت علی مصلح سنگ نے ابتدا سے اس دم تک جو جو مشکل کام پیش آئے مستقلانہ کوشش سے اس خوبی کے ساتھ انجام دیئے اکثر کاغذات و کتب مطبوعہ مطبع کا کوئی دعویٰ مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ شخص بھی رکن عظیم مطبع کے ہیں[1]

میر حشمت علی طویل عرصہ تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ منشی نولکشور کی مذکورہ بالا تحریر پڑھ کر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ میر صاحب نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے قبل لکھنؤ کے شاہی مطبع یا دیگر مطابع میں اصلاح سنگ کا کام کیا ہوگا۔ جب ہی ان کو اس فن میں مہارت حاصل ہوئی ہوگی۔ اور ۱۸۵۸ء میں مطبع کے قیام کے بعد منشی نولکشور نے ان کی خدمات حاصل کرلی ہوں گی۔ میر حشمت علی کے دو بیٹے تھے، دونوں بہت اچھے خوشنویس تھے، ایک امیر علی دوسرے وزیر علی۔ ان کے حالات زندگی اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوسکے۔ اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے آخری دور تک مطبع نولکشور سے وابستہ رہے۔ ترقی کرکے شعبۂ اصلاح سنگی" کے افسر ہوگئے اور کچھ عرصہ بعد کارخانہ لیتھوگرافی کے ایک سکشن کے منیجر مقرر ہوئے۔ جیسا کہ منشی نولکشور کی مندرجہ ذیل تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔

میر حشمت علی۔ پہلے مصلح سنگ کے سررشتہ کے افسر تھے۔ لیکن ترقی خاص حاصل کرکے مزید برآں کارخانہ لیتھوگرافک کے حلقۂ دوم کے افسر اور مہتمم ہیں اور سررشتۂ اصلاحِ سنگ کے بھی افسر ہیں۔ پتھر کی اصلاح میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ انتظام بھی طبیعت میں معقول ہے[2]

مئی ۱۸۶۸ء میں مطبع نولکشور سے پدماوت بھاکا بخط نستعلیق طبع ہوئی تھی۔ اس میں

---

[1] روداد مطبع نولکشور ۱۸۶۲ء از منشی نولکشور مطبوعہ اودھ اخبار شمارہ ۸ جنوری ۱۸۶۳ء۔ یہ فائل ایوان غالب نئی دہلی کی لائبریری میں موجود ہے۔

[2] روداد مطبع نولکشور مرتبہ منشی نولکشور مطبوعہ اودھ اخبار شمارہ ۸ جنوری ۱۸۷۳ء۔

استاد ناسخ کے شاگرد مولوی محسن علی ساقی کی منظوم تقریظ شامل ہے۔ جس میں مطبع اور کارکنان مطبع کی تعریف بھی کی ہے۔ میر حشمت علی کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

وہ استاد ہیں میر حشمت علی — کہ پتھر پہ لکھیں خفی اور جلی
کہوں کیا جو پتھر بناتے ہیں وہ — تو قدرت خدا کی دکھاتے ہیں وہ
چھپے صاف سیدھا جو الٹا لکھیں — نہ کہیے کرامت تو پھر کیا کہیں[1]

زائر حرم، حمید لکھنوی مشہور نعت گو شاعر، حمید لکھنوی، بہت ماہر خطاط اور خوشنویس تھے۔ انہوں نے اپنے فطری ذوق کے باعث بچپن سے خطاطی و خوشنویسی کی مشق شروع کی اور بہت تیزی سے ترقی کی طرف گامزن ہوتے۔ انہوں نے منشی عبد الرحیم کی شاگردی اختیار کی۔ جب مہارت حاصل ہوئی تو کتابت کو پیشہ بنایا۔ قدرت نے شعر و شاعری کا ذوق ان کی فطرت میں ودیعت کیا تھا۔ شعر خوب کہتے تھے۔ انہوں نے پہلے کتابت کو پیشے کے طور پر اختیار کیا۔ خط نستعلیق میں ان کی مہارت مسلّم تھی۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں سے ان کے کمالِ فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ حمید نے نعت گوئی میں ایک نیا انداز اختیار کیا۔ ان کے نعتیہ اشعار اور نظمیں سننے والوں کے دلوں پر بہت اثر انداز ہوتی ہیں۔ اپنا کلام وہ بڑے والہانہ انداز میں پڑھتے تھے۔ لکھنؤ کے مشہور تاجر عطر اصغر علی محمد علی کے کارخانے کے متولی حاجی اصطفیٰ خان، حمید کے نعتیہ کلام سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کو اپنے ساتھ حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ اطہر کے لئے لے گئے۔ اس کے بعد حمید نے کتابت سے کنارہ کشی اختیار کی اور حاجی اصطفیٰ خان کی مصاحبت اختیار کی۔ کئی سال مسلسل ان کے ساتھ حج و زیارت کے لئے جاتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد حاجی صاحب موصوف پاکستان چلے گئے۔ حمید لکھنوی نے اپنے ملک کی سکونت ترک نہیں کی۔ انہوں نے آزادی کے بعد لکھنؤ میں وفات پائی۔ ان کا نعتیہ کلام "کلیاتِ حرم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کے کئی مجموعوں کی کتابت کی ہے۔ ان کے علاوہ متعدد اردو کتابوں کی کتابت کر کے اپنے کمالِ فن کی

---

[1] یدِ ماورت یہاں کا صفحہ ۳۵۴ تا ۳۵۹ مطبوعہ نولکشور پریس ماہ مئی سنہ ۱۹۷۰ء۔

داد دی ہے۔ حمید لکھنوی مدرسہ فرقانیہ میں عرصہ تک خوشنویسی کے استاد رہے۔

خیراتی لال شگفتہ شگفتہ، نہایت اچھے خطاط اور خوشنویس تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق فطری تھا۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے ایک ذی علم کائستھ خاندان سے تھا جو محلّہ نوبستہ میں آباد تھا۔ جہاں گو بند پرشاد فضا نوبت رائے نظر اور دوارکا پرشاد افق جیسے ممتاز ادیب، صحافی اور شاعر رہتے تھے۔ شگفتہ نے شاعری میں نسیم دہلوی کی شاگردی اختیار کی، خوشنویسی و خطاطی امیر اللہ تسلیم سے حاصل کی۔ اودھ اخبار اور مطبع نولکشور میں کتابت کرتے تھے خط نستعلیق بہت اچھا لکھتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے، منشی چاند بلی تکلّم اور منشی سورج بلی تبسم۔ دونوں نہایت اچھے خطاط و خوشنویس تھے اور مطبع نولکشور کے کاتبوں میں شامل تھے۔ اس خاندان کے بیشتر فنکار بالواسطہ یا بلا واسطہ مطبع نولکشور سے وابستہ رہے۔

منشی خلیل احمد لکھنؤ کے بہت ماہر فن خطاط، خوشنویس اور کاپی نگار تھے۔ اودھ اخبار کی کتابت کرتے تھے۔ مطبع نولکشور اور اودھ اخبار میں کتابت کرنے والے کاتبوں میں نمایاں حیثیت حاصل تھی منشی نولکشور ان کے کام سے بہت مطمئن اور خوش رہے۔ مطبع کے قدیم کاغذات سے اتنا ہی معلوم ہو سکا۔ ۱۸۹۴ء میں مطبع نولکشور کے اندر ان کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

منشی دیبی پرشاد سحر ۱۴ دسمبر ۱۸۴۴ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن قصبہ بالامئو ضلع ہردوئی ہے۔ انکے والد منشی جیتی لال کائستھ خاندان کے ذی علم شخص تھے، جن کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا۔ سحر نے بدایوں میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اردو فارسی پڑھی، یہی زبانیں ان کا ابتدائی ذریعہ تعلیم رہیں۔ انگریزی کی تعلیم بدایوں اور ہردوئی میں حاصل کی۔ خوشنویسی کا شوق بچپن سے تھا، خطاطی کی مشق اپنے ذوق کے مطابق کرتے رہے۔ بعد میں بعض اساتذہ فن سے خوشنویسی کے اصول و ضوابط کی تحصیل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت کرلی۔ اور بحیثیت استاد

مختلف مقامات کے اسکولوں میں پڑھاتے رہے۔ اپنے طلبار کو بھی خوشنویسی کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرکے سررشتہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا۔ سحر تخلص رکھا۔ نصابی کتابوں کے سلسلہ میں مطبع نولکشور سے رابطہ قائم ہوا۔ ملازمت سے سبکدوش کے بعد مطبع نولکشور سے وابستہ ہوگئے۔ انہوں نے کتابت بھی کی اور مبتدیوں کو فن خوشنویسی کی تعلیم دی۔ یہ انکا محبوب مشغلہ تھا۔ انہوں نے اس فن کو سیکھنے والوں کے لئے دو کتابیں تصنیف کرکے بہت شہرت حاصل کی۔ ایک کا نام "نظمِ پردین" اور دوسری "ارژنگ چین" ہے۔ یہ فن خطاطی و خوشنویسی کی بہترین مستند کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ انہوں نے طلبار کے لئے محکمہ تعلیم کی ہدایت پر نصابی کتابیں بھی مرتب کی ہیں۔ مطبع نولکشور کی نصابی کتب کے شعبہ میں نگراں بھی تھے۔ انہوں نے مختلف مضامین کی نصابی کتابیں مرتب کی ہیں۔ جن میں خلاصۃ المنطق، معیار الاملار، محیط المساحت، مراۃ العالم اور متعدد دوسری کتابیں شامل ہیں۔ یہ سب مطبع نولکشور سے شائع ہوئیں۔

نظمِ پردین، پہلی بار ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کی کتابت سنگِ چسپیدہ محفوظ رہی اس پر متعدد بار طبع ہوئی۔ جب پتھر پر کتابت کمزور پڑگئی تو منشی پراگ نرائن کے عہد میں، منشی شمس الدین اعجاز رقم نے اس کی کتابت دوبارہ کی مصنف نے منشی نولکشور کی ہدایت پر ۱۸۷۱ء میں نظر ثانی کی تھی۔ اس کی کتابت بھی سنگ چسپیدہ رہی جب وہ کمزور پڑگئی تو منشی پراگ نرائن نے ۱۹۰۱ء میں منشی شمس الدین سے اس کی کتابت دوبارہ کرائی اور اس کو پہلے سے بہتر صورت میں شائع کیا۔ اس پر مولانا عبد العلی آسی نے طویل قطعۂ تاریخ لکھا جس کا پہلا شعر ہے

ہے حرفِ اولین پہ تفصیل حرف ثانی　　　نقش دوم کا نقشہ ہے رشکِ نقشِ مانی

شمس الدین کی لکھی ہوئی کتاب پتھر چسپیدہ متعدد ایڈیشن نکلنے کے بعد کمزور ہوگئی تو ان کے شاگرد رشید منشی نواب نے ۱۹۵۱ء میں اس کی نئی کتابت کی اور استاد کے خط سے خط ملانے کی کامیاب کوشش کی۔ موجودہ ایڈیشن منشی محمد نواب کا تحریر کیا ہوا ہے۔

سیّد ریاض الحسن زمانۂ حال کے مشہور اور ماہرِ فن خوشنویس تھے۔ نسخ و نستعلیق دونوں خطوں میں مہارت

حاصل تھی، لیکن خط نستعلیق پر زیادہ توجہ رہی۔ مرزا محمّد جواد کے شاگرد تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی نجم الحسن خط نسخ بہت اچھا لکھتے ہیں، ان کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔ لکھنؤ کے ممتاز کاتبوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق بھی نظامی پریس سے رہا۔ انہوں نے خط نستعلیق میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ کتابت کے رموز و نکات پر گہری نظر تھی۔ خط جلی بہت اچھا لکھتے تھے۔ انہوں نے پروفیسر مسعود حسن رضوی کی بعض تصانیف کی کتابت کی ہے جن میں رزم نامۂ انیس اور ہماری شاعری بھی شامل ہیں۔ ریاض الحسن نے ۱۹۵۵ء کو ۴۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

منشی سرجو پرشاد مطبع نولکشور میں کاپی نویسی پر مامور تھے، لکھنؤ کے اچھے خوشنویسوں میں تھے۔ ان کا تعلق محلہ نوبستہ کے ایک کائستھ خاندان سے ہے، اس محلے میں اودھ کے شاہی دور سے بیشتر آبادی کائستھوں کی تھی، جو علم و ادب کے دلدادہ تھے، ان میں شعر و شاعری، خوشنویسی اور دیگر علوم و فنون کی تحصیل کا ذوق و شوق عام تھا۔ اسی لئے خوشنویسوں کی بڑی تعداد اس محلے میں موجود تھی۔ سرجو پرشاد بھی اسی سلسلہ میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ اودھ اخبار کی کتابت بھی کرتے تھے اور مطبع کی کتابوں کی فہرستیں لکھنے والے کاتبوں میں بھی شامل تھے۔ ۱۸۸۹ء کے ایک رجسٹر احکامات میں کئی جگہ ان کا نام فہرست نویس کاتب کی حیثیت سے ملتا ہے[1]۔

شرف علی شرف مطبع نولکشور سے وابستہ خوشنویسوں میں اپنی فنی مہارت کے باعث بہت نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ خط نسخ اور نستعلیق دونوں میں ماہر تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے لکھنؤ کے مختلف مطابع میں کتابت کرتے رہے۔ ان کا شمار لکھنؤ کے باکمال خطاطوں میں کیا جاتا ہے۔ شرف منشی امیر اللہ تسلیم کے ہم عصر تھے لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کس کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اودھ اخبار کی کتابت اس کے ابتدائی دور میں کی۔ چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھیں۔ وہ ایک تجربہ کار استاد فن تھے۔ اسی لئے منشی نولکشور نے ان کو اپنے مطبع

---

[1] رجسٹر احکامات ۱۸۸۹ء میں ان کا ذکر ہے۔

میں کام کرنے کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ ان کے بہت سے شاگرد بھی ہیں۔ شرف نے آخر عمر تک مطبع نولکشور سے اپنی وابستگی قائم رکھی۔[1]

منشی شیو پرشاد وہبی مطبع نولکشور کے مشہور خطاط اور باکمال خوشنویس تھے، خط نستعلیق میں خاص مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے فارسی اور اردو کی بہت سی کتابوں کی کتابت کی۔ ان کی لکھی کتاب کلیات شمس تبریز" خط نستعلیق کا دلکش نمونہ ہے۔ ایک ہزار چھیالیس صفحات کی اس کتاب کی نصف کتابت انہوں نے کی ہے اور باقی نصف حصہ منشی آلِ حسن نے لکھا۔ اور یہ عجب اتفاق ہے کہ دونوں کے خط میں اس قدر یکسانیت ہے کہ مطلق کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ منشی نولکشور نے کتابت کے لئے ان کو مطبع میں تقرر کیا تھا، لیکن وہ انتظامی معاملات میں بہت باصلاحیت اور اچھے تعلیم یافتہ تھے اس لئے ان کو کچھ عرصے بعد مطبع کا منیجر بنا دیا گیا۔ اس ذمہ دار عہدہ پر رہ کر انہوں نے بہت نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ مطبع نولکشور کے ابتدائی دور میں اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ نہایت محنتی اور نیک نفس تھے۔ منشی نولکشور نے مطبع کی روداد بابت ۱۸۹۲ء میں ان کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا وہ درج ذیل ہیں۔

> منشی شیو پرشاد منیجر مطبع: یہ شخص خاندانی باتوقیر ہے۔ لیاقت اور سنجیدہ شعاری میں بے نظیر ہے۔ اس سے پہلے محرری اودھ اخبار پر مقرر تھے لیکن اپنی جبلی لیاقت اور کارگزاری سے مطبع کی خدمت سترگ پر ترقی کی۔ امید ہے کہ آئندہ اپنی نیک روش اور حسن کاردانی سے خاطر خواہ مطبع کے کام میں مدد دیں گے۔[2]

منشی نولکشور کی مذکورہ تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیو پرشاد کا تعلق کسی معزز خاندان سے تھا اور وہ اپنی فطری ذہانت اور علمی لیاقت کے باعث ترقی کر کے خوشنویس اور کاتب کے عہدہ سے ترقی کر کے منیجر کے معزز منصب پر فائز ہوئے۔

---

[1] صحیفۂ خوشنویساں میں بھی مختصر حال درج ہے۔

[2] روداد مطبع نولکشور، تعلیم نولکشور، مطبوعہ اودھ اخبار شمارہ ۹ جنوری ۱۸۹۳ء

یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اودھ اخبار کے دفتر میں بھی کام کرتے رہے۔ شیو پرشاد کو شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا۔ وہبی تخلص تھا جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ کتابت کو انہوں نے پیشے کی حیثیت سے اختیار کیا تھا۔ ان کو اپنے اس فن سے گہرا لگاؤ تھا۔ منشی نولکشور نے ۱۸۷۱ء میں اپنے مطبع کی جو سالانہ روداد قلمبند کی تھی اس میں ان کی بعض صفات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے

> منشی شیو پرشاد صاحب منیجر مطبع اپنی قدامت اور ہر سال کی رپورٹ سے جو خود ان کی نسبت جیسا کہ کارخانے کا اعتماد ہے۔ ظاہر ہے منیجر صاحب شاعر اور خوشنویسی میں بھی کامل ہیں[1]

منشی نولکشور کی مذکورہ تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مطبع نولکشور کے کارکنوں میں ان کی کس طرح قدر و منزلت تھی۔ شیو پرشاد نے خوشنویسی میں کس کی شاگردی اختیار کی اس کے متعلق قطعی بات نہ معلوم ہو سکی لیکن بعض حالات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مولوی ہادی علی یا امیر اللہ تسلیم میں سے کسی ایک کے سامنے زانوئے ادب تہہ کئے ہوں گے۔ شیو پرشاد آخر عمر تک مطبع نولکشور سے وابستہ رہے۔ مطبع نولکشور کے پرانے ریکارڈوں سے معلوم ہوتا ہے وہ ۱۸۸۶ء تک بقید حیات تھے۔ ان کی وفات لکھنؤ میں ہوئی۔ سن وفات کا علم نہ ہو سکا۔

منشی شمس الدین، اعجاز رقم ماہر خطاط، ممتاز خوشنویس اور بلند پایہ نستعلیق نگار کی حیثیت سے، منشی شمس الدین کو ہمہ گیر شہرت حاصل ہے۔ وہ لکھنؤ کے محلہ باغ قاضی میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس زمانے کے عام رواج کے مطابق، اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں اچھی استعداد پیدا کی۔ طالب علمی کے زمانے سے خوشنویسی کا شوق ہوا اور اس پر خاص توجہ کی۔ اس زمانے میں مطبع نولکشور میں اس فن کے ماہر اساتذہ موجود تھے جن میں مولوی ہادی علی جیسے یگانۂ روزگار فنکار کی شہرت عام تھی۔ منشی شمس الدین نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا، اور ان کی نگرانی میں مشق و مزاولت سے بہت جلد ایک امتیازی حیثیت

---

[1] روداد مطبع بقلم نولکشور مطبوعہ اودھ اخبار نومبر ۱۸۷۱ء

حاصل کرلی۔ منشی شمس الدین نے خطِ نستعلیق کو اپنی ذہانت اور مسلسل مشق سے ایک نیا رنگ و روپ دیا، جس کو علمی و ادبی دنیا میں بہت پسند کیا گیا۔ ان کے طرزِ خط کو ایران، افغانستان وغیرہ میں بہت پسند کیا گیا۔

منشی نولکشور بڑے مردم شناس انسان تھے۔ انہوں نے منشی شمس الدین کی فنکارانہ مہارت کے پیشِ نظر ان کو اپنے مطبع میں کام کرنے کے لئے راضی کر لیا اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی جو اس زمانے میں گرانقدر سمجھی جاتی تھی۔ ان کے لئے مطبع کے مقررہ اوقات کی پابندی لازمی نہ تھی۔ وہ اکثر اپنی قیام گاہ پر مطبع کا کام کرتے تھے۔ صبح کے چند گھنٹے وہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں جزوقتی استاد کی حیثیت سے طلباء کو خوشنویسی سکھاتے تھے۔ مدرسہ فرقانیہ کے بانی حضرت مولانا عین القضاۃ منشی شمس الدین کو بہت پسند کرتے تھے اور ان کے ساتھ نہایت محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ منشی شمس الدین کو بھی ان سے بہت عقیدت تھی۔ ایک بار لاہور کے کسی مشہور خوشنویس کی بظاہر بہت خوبصورت تحریر میں منشی شمس الدین نے فنی نقائص کی واضح طور پر نشاندہی کی تو اس پر خوش ہو کر مولانا موصوف نے سو روپیہ بطور انعام عطا کیا اور اعجاز رقم کا خطاب دیا جو اب انکے نام کا جز ہو گیا ہے بلکہ اصل نام سے زیادہ مشہور ہے۔

مطبع نولکشور میں انہوں نے بہت سی کتابوں کی کتابت کی، لیکن ان کی لکھی ہوئی کتابوں میں 'دیوانِ حافظ'، گلستان جلی قلم، گلستاں با تصویر مطبوعہ ۱۳۱۰ھ ہجری قابلِ ذکر ہیں۔ اس گلستان کی صحت مولوی ہادی علی نے کی تھی اور اس پر مولانا عبدالعلی آسی مدراسی نے تقریظ لکھی تھی۔ منشی شمس الدین کی کتابت کی ہوئی گلستان اور بوستان کے چسپیدہ پتھر طباعت کے بعد محفوظ رکھے گئے اور ان پر کئی کئی ایڈیشن طبع ہوئے۔ اسی طرح دیوان حافظ کے چسپیدہ پتھر مدتوں محفوظ رہے۔ مطبع کے پرانے ریکارڈ کی چھان بین سے اندازہ ہوا کہ گلستان کے جتنے ایڈیشن شائع ہوئے اتنے کسی اور فارسی کتاب کے نہیں ہوئے۔ مجموعی طور پر مطبوعہ نسخوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہے۔ مطبع کے ابتدائی اور درمیانی دور کی فارسی مطبوعات، خصوصاً گلستان و بوستان زیادہ تعداد میں، چینی ترکستان، ایران اور افغانستان کے تاجر ان کتب خود آ کر لے گئے یا دیگر ذرائع سے منگوائیں۔

منشی نولکشور نے اپنی زندگی میں اعجاز رقم کی فنکارانہ صلاحیتوں کی پوری قدر کی اور ہر طرح اُن کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، مطبع کو بھی ان کی خدمات سے بہت فائدہ ہوا۔ منشی نولکشور کے بعد ان کے جانشین منشی پراگ نرائن نے بھی ان کے نقش قدم پر چلے۔ آخر عمر میں منشی شمس الدین نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ ضعیفی کے باعث لکھنے سے مجبور ہو گئے تھے، انہوں نے طویل عمر پائی۔ ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر نوّے سال تھی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ۱۸۵۶ء کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔

اعجاز رقم نے بہت سادہ زندگی بسر کی، نہایت منکسر المزاج تھے، ہمیشہ چٹائی پر بیٹھ کر لکھتے تھے اور اسی پر سونا پسند کرتے تھے۔ وہ ہر سال مولانا عین القضاۃ کے ساتھ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے عرس میں شرکت کے لئے سرہند جاتے تھے۔ مجدد صاحب کے مزار پر ان کے لکھے ہوئے کتبات موجود ہیں۔ نواب صدیق حسن خان ان کے بڑے قدردان تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے، ممکن ہے انہوں نے نواب موصوف کے کسی مسودہ کی کتابت بھی کی ہو، لیکن مستند طور پر اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

تصانیف منشی شمس الدین نے فن خوشنویسی پر کئی کتابیں لکھی ہیں، ان کی سب سے زیادہ مشہور کتاب اعجازِ رقم ہے جس میں انہوں نے اس فن کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اور خوشنویسی کے اصول و ضوابط متعین کئے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے مبادیات مفرد اور مرکب حروف اور جملوں کے نمونوں کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ صنفِ نستعلیق نگاری کی اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ برابر جاری ہے اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اس کتاب کے علاوہ انہوں نے، تنویر الشمس، تصنیف کی۔ ان کے لکھے ہوئے خوش نما اور دیدہ زیب قطعات اور وصلیاں مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے کتبخانوں میں موجود ہیں۔ کچھ بعض اہل ذوق کی ذاتی ملکیت ہیں۔ ممکن ہے بعض دوسرے اداروں اور کتب خانوں میں بھی موجود ہوں۔ اس کے علاوہ ان کی حسب ذیل کتابیں یادگار ہیں۔ مرقع نگاریں۔ گلدستہ ریاحین۔ کاپی بک خوشخطی ۵ حصے۔

اولاد منشی شمس الدین کے دو بیٹے تھے۔ معین الدین اور قطب الدین۔ دونوں نے خوشنویسی کی تعلیم حاصل کی تھی اور نہایت اچھے خوشنویس تھے۔ عرصے تک دونوں مطبع نولکشور میں کتابت کرتے رہے۔ لیکن مطبع سے وابستہ نہ تھے۔ دوسرے مطابع میں بھی کام کرتے تھے۔ دونوں کے حالاتِ زندگی باوجود تلاش و جستجو کے دستیاب نہ ہو سکے۔

تلامذہ اعجاز رقم کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے۔ سب کے نام اور حالات معلوم کرنا ممکن نہیں، اگر ان کے کسی ہم عصر اہل قلم نے اس طرف توجہ کی ہوتی تو ہمیں مفید معلومات حاصل ہوتیں۔ ان کے بعض شاگرد مہارت فن میں ان کے ہم پلّہ ہو گئے تھے۔ ان میں منشی محمد افضل، منشی حامد علی مرصع رقم، منشی محسن علی جونپوری، منشی عبد الرحیم کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ منشی شمس الدین کے شاگردوں کی بدولت فن خوشنویسی لکھنؤ میں کبھی غیر معمولی زوال سے دوچار نہیں ہوا، اور ان کا فیض آج تک جاری و ساری ہے۔

منشی صفدر علی

عہدِ نولکشور میں اودھ اخبار اور مطبع کے فن شناس خوشنویس اور ماہر کاتب تھے۔ وطن کا علم نہیں، لیکن ان کی زندگی لکھنؤ میں گزری۔ ان کو خط نستعلیق میں مہارت حاصل تھی۔ نسخ بھی خوب لکھتے تھے۔ اودھ اخبار کے مضامین کی کتابت کرتے تھے۔ مطبع کی چند کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان کے متعلق مطبع نولکشور کے بعض رجسٹروں سے صرف اسی قدر معلوم ہو سکا کہ وہ مطبع سے وابستہ تھے۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس کے شاگرد تھے۔ اور کہاں تعلیم و تربیت ہوئی۔

عبّاس علی

مطبع نولکشور سے تعلق رکھنے والے ماہر نستعلیق نگار کاتب تھے۔ انہوں نے اودھ اخبار میں بھی کام کیا اور کتابیں بھی لکھتے رہے۔ لیکن ان کا زیادہ وقت مطبع کی فہرست کتب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ کیونکہ کتابیں بکثرت چھپنے کے باعث فہرستوں میں بار بار ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اور کئی قسم کی فہرستیں الگ الگ شائع ہوتی تھیں۔ اسی لئے متعدد کاتب اس کام پر مامور تھے۔ ان میں عباس علی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ رجسٹر احکامات مالک مطبع بابت سنہ ۱۸۸۹ء میں منشی نولکشور کا ایک حکم درج ہے کہ فہرست کتب جدید جو کاتب لکھیں ان کا نمونہ پیش ہو۔ اس حکم کی تعمیل میں منشی حسین احمد منصرم نے لکھا کہ عباس علی کو تجویز کیا گیا ہے۔ اگر حکم پر دستخط ہو جائیں تو یہ کام ان کو دے دیا جائے۔[۲] وہ مطبع میں ملازم نہ تھے مگر اجرت پر مستقل

←

کام کرتے تھے۔ اور زندگی بھر اسی مطبع سے تعلق رکھا۔ باہر کے کام شاذ و نادر ہی کیے ہونگے۔

حافظ علی حسین لکھنؤ کے ایک معزز اور ذی علم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ خطاطی اور خوشنویسی میں مہارت حاصل تھی۔ ان کا شمار عربی، فارسی اور اسلامی تعلیمات کے فاضلوں میں کیا جاتا ہے۔ شعر و شاعری کا پاکیزہ ذوق تھا۔ فارسی میں زیادہ شعر کہتے تھے، فوز تخلص رکھا۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے سے خوشنویسی پر پوری توجہ کی، رفتہ رفتہ نسخ و نستعلیق دونوں میں کمال حاصل کر لیا۔ ان کے والد ماجد بھی ایک عالم اور خطاط تھے اسی کے ساتھ حافظ قرآن بھی تھے علی حسین نے بھی قرآن حفظ کر لیا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد فکر معاش میں سرگرداں ہوتے یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ پہلے کس ادارے میں کام کیا، لیکن یہ بات وضاحت کے ساتھ معلوم ہے کہ انہوں نے مطبع نولکشور کا رخ کیا اور منشی نولکشور نے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں سے متاثر ہو کر مطبع کے لئے ان کی خدمات مستقل طور پر حاصل کر لیں۔ اور ان کو اپنے دار الکتابت میں کاپی نویسی کا کام دیا۔ علی حسین نے کتابت کو ذریعہ معاش بنایا۔ ابتدا ہی سے اس معزز پیشے کو قابل عزت و احترام سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے انہوں نے اس پیشے کو اختیار کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ مطبع نولکشور میں انہوں نے بکثرت عربی فارسی اور بعض اردو کتابوں کی کتابت کی، ساتھ ہی تصحیح کتب کی خدمت بھی انجام دی۔ وہ مولوی ہادی علی اشک اور منشی شمس الدین اعجاز رقم کے ہم عصر تھے۔ لیکن یہ تحقیق نہ ہو سکی کہ انہوں نے خوشنویسی میں کس کی شاگردی اختیار کی۔ مطبع نولکشور کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ بھوپال چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ وہیں وفات پائی۔

حافظ علی حسین کی اولاد میں ان کے فرزند مولانا محمد حسین محوی بہت نامور عالم، شاعر اور ادیب تھے جن کو علمی حلقوں میں شہرت حاصل ہے۔ وہ اردو لغت کی تدوین میں مولوی عبد الحق کے شریک کار رہے، اس کے بعد عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد مدراس یونیورسٹی میں طویل عرصے تک لکچرار رہے، سبکدوش ہونے کے بعد مستقل قیام بھوپال میں رہا۔ مولانا محوی نے بھی کچھ عرصہ

لہ رجسٹر احکامات مالک مطبع بابت سنہ ۱۹۰۹ء موجود محافظ خانہ نولکشور۔

مطبع نولکشور میں بحیثیت مصنّف و مترجم کام کیا۔ انہوں نے ۱۹ر نومبر ۱۹۷۵ء میں وفات پائی۔ ان کے حالات سے اندازہ ہوا کہ حافظ علی حسین کی وفات ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان ہوئی۔

منشی عبدالرحیم لکھنؤ کے بہت اچھے خطاط اور خوشنویس تھے۔ ان کو شمس الدین اعجاز رقم سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ نسخ اور نستعلیق دونوں خط اچھے تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ مطبع نولکشور میں کتابت کا کام کیا، متعدد فارسی اور اردو کتابیں لکھیں۔ اس کے بعد نامی پریس سے وابستہ ہو گئے۔ یہ مشہور پریس خواجہ قطب الدین نے قائم کیا تھا، جو پہلے مطبع نولکشور میں ملازم تھے اور دستی پریس چلانے پہ مامور تھے۔ جب انہوں نے اپنا مطبع قائم کیا تو ان کو مطبع نولکشور دستی پریس قسطوں پر دیا گیا۔ بعد میں خواجہ قطب الدین کی محنت اور حسنِ انتظام کے باعث اس پریس نے بہت ترقی کی، اردو، فارسی اور عربی کی کئی سو کتابیں شائع کیں۔ ان کے یہاں کتابت کرنے والے وہی کاتب زیادہ تھے جنہوں نے مطبع نولکشور کے دارالکتابت میں تربیت حاصل کی تھی۔ منشی عبدالرحیم کو مہارت فن کے باعث نامی پریس میں بہت اہمیت حاصل تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی منشی عبدالولی نے بھی ان ہی کی نگرانی میں خوشنویسی کی تربیت پائی۔ وہ بھی نہایت اچھے خوشنویس اور کاتب تھے۔ منشی عبدالرحیم کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے۔ ان میں سے چند اب بھی اس فن شریف کی خدمت کر کے اپنی معاشی مشکلات کو بخوبی دور کر رہے ہیں۔ منشی عبدالرحیم محلہ کھالہ بازار وکٹوریہ اسٹریٹ پر رہتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں، مشہور نعت گو شاعر زائرحرم حمید صدیقی قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے طویل عمر میں وفات پائی۔ تاریخ و سنہ وفات صحت کے ساتھ معلوم نہ ہو سکا۔

لہ حافظ علی حسین کے حالات زندگی معلوم کرنے کے لئے ان کے پوتے جناب منیرالمہدی اور بھوپال کے بعض احباب کو راقم السطور نے بالواسطہ اور بلاواسطہ متعدد خطوط لکھے مگر کہیں سے بھی جواب نہ ملا، کچھ باتیں مطبع نولکشور کے کاغذات سے معلوم ہوئیں اور کچھ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے مضمون سے جو نیا دور لکھنؤ شمارہ ماہ مارچ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔

مولوی حافظ عبدالصمد اتر پردیش کے شہر ہردوئی کے ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ اسلامی علوم کی تحصیل پر خاص توجہ کی۔ طالب علمی کے زمانے سے خوشنویسی و خطاطی کا شوق تھا۔ خط نسخ کے بلند پایہ استاد تھے۔ ان کو نسخ سے غیر معمولی شغف تھا۔ اور اس کو بہتر سے بہتر طریقہ پر لکھنے کی مشق کی تھی۔ انہوں نے تحصیل علم کے بعد کتابت قرآن مجید پر خاص توجہ کی، بلکہ ساری عمر وہ قرآن مجید کی کتابت کرتے رہے۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن اور حمائل لکھنؤ کے علاوہ دہلی سے شائع ہوئے ہیں۔ مولوی عبدالصمد مطبع نولکشور سے باقاعدہ وابستہ نہ تھے۔ لیکن زیادہ تر مطبع کے قرآن شریف محشّٰی اور مترجم وہی لکھتے تھے۔ خط نسخ میں مہارت کے باعث ان کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ انہوں نے منشی نولکشور کی وفات کے بعد ان کے مطبع سے تعلق قائم کیا تھا۔ مطبع کے لئے انہوں نے آخری عمر میں جو قرآن مجید لکھا وہ ۲۴ جزو میں ہے اور بہت دیدہ زیب ہے۔ راقم الحروف نے ان کو دیکھا ہے اور شرف ملاقات بھی حاصل کیا۔ نہایت نیک دل، سادہ مزاج تھے۔ مسوّدات کی کتابت وہ ہردوئی میں اپنے مکان کے اندر کرتے تھے اور کام مکمل کر کے خود مالک مطبع کے پاس پہنچا دیتے تھے۔ وقت کے پابند اور با اصول انسان تھے۔ انہوں نے طویل علالت کے بعد اپنے وطن میں وفات پائی۔ ان کا سال وفات ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان ہے۔ صحیح سال اتفاق سے نہیں مل سکا۔

سیّد علی حسین لکھنؤ کے ماہر فن خوشنویس تھے۔ ان کو کتابت اور معکوس نگاری میں مہارت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ نہایت اچھے سنگ ساز بھی تھے۔ ان خوبیوں کے باعث ان کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ خط نستعلیق میں مہارت حاصل کی، نسخ اور شکستہ میں بھی خوب مشق تھی۔ مطبع نولکشور میں ملازم تھے اسی زمانے میں مولانا عبدالحلیم شرر اودھ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ علی حسین کتابوں کے علاوہ اودھ اخبار کی کتابت بھی کرتے تھے۔ شرر کو ان کا طرز نگارش پسند تھا۔ ساتھ کام کرنے کے باعث دونوں میں روابط قائم ہوئے۔

اسی زمانے میں شرر نے ایک رسالہ جاری کیا تھا جس پر نام ان کے ایک دوست کا لکھا جاتا تھا کیونکہ خود مطبع نولکشور میں ملازم تھے۔ اس رسالے کی کتابت علی حسین سے کراتے تھے۔ مطبع کی ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد شرر نے اپنا مشہور رسالہ دلگداز نکالا۔ اس کی کتابت بھی علی حسین کرتے تھے۔ پتھر پر الٹا لکھنے میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا پوری کتاب پتھر پر لکھتے تھے (پورا رسالہ دلگداز پتھر پر الٹا لکھتے تھے) علی حسین لکھنؤ کے رہنے والے تھے[1]۔ انہوں نے خوشنویسی کی تعلیم منشی شمس الدین اعجاز رقم سے حاصل کی وہ اعجاز رقم کے ارشد تلامذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔

غلام محمدؐ خان ماہر خطاط اور خوشنویس ہونے کے علاوہ معکوس نویسی میں کمال حاصل تھا۔ وہ پتھر میں نہایت تیز رفتار الٹا لکھ دیتے تھے۔ مطبع نولکشور سے وابستہ تھے۔ کچھ عرصہ کتابت کرتے رہے لیکن معکوس نویسی میں مہارت کے باعث ان کے سپرد اصلاح سنگ کی خدمت کی گئی۔ اس کے علاوہ اگر کسی مختصر کتاب یا دوسری کسی تحریر کو بہت جلدی طبع کرنا مقصود ہوتا تو ان سے پتھر پر لکھوایا جاتا تھا۔ ان کو اپنے فن میں اس درجہ مہارت تھی۔ اگر کسی چیز کی نقل کرنا ہوتا تو اس خوبی سے کرتے تھے کہ نقل کو اصل بنا دیتے تھے۔ وہ اپنے فن کے استاد تھے۔ ان کی بدولت معکوس نویسی کو ترقی ہوئی۔ اور انہوں نے اپنے شاگردوں کا ایک بڑا گروہ تیار کر دیا جس کی بدولت دوسرے مطابع کو اچھے معکوس نویس مل گئے۔ غلام محمد کو مطبع نولکشور میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ منشی شمس الدین کے ہم عصر تھے۔ ان کے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

فیاض حسین مطبع نولکشور کے خاص کاتب تھے۔ خط نسخ اور نستعلیق دونوں لکھتے تھے لیکن نستعلیق میں ان کی مہارت مسلم تھی۔ لکھنؤ میں سے ان کا خاندان زمانہ قدیم سے آباد تھا۔ خوشنویسی خاندانی ورثہ تھا۔ ان کے بیٹے جعفر حسین نہایت اچھے خوشنویس تھے۔ وہ بھی مطبع نولکشور سے وابستہ رہے۔ فیاض حسین نے اردو فارسی کی بہت سی کتابوں کی کتابت کی۔ نصابی کتابیں لکھنے میں زیادہ دقت

---

[1] گذشتہ لکھنؤ از شرر

صرف کرتے تھے۔ خط نہایت پختہ اور شگفتہ تھا۔ انہوں نے نوے سال کی عمر میں ۱۹۴۹ء کو وفات پائی۔ ان کے چھوٹے بیٹے ذاکر حسین کو بھی کتابت میں اچھی استعداد حاصل ہوئی لیکن وہ مستقل طور پر اس فن کی خدمت نہ کر سکے۔ اب بھی بقید حیات ہیں۔ فیاض حسین بھی منشی شمس الدین کے شاگرد رہے۔

جعفر حسین منشی فیاض حسین کے بیٹے تھے۔ نہایت اچھے خطاط و خوشنویس تھے۔ عرصہ تک مطبع نولکشور سے وابستہ رہے۔ انہوں نے خوشنویسی کی تعلیم اپنے والد کی زیر نگرانی حاصل کی۔ یہ فن ان کے خاندان میں رائج تھا۔ اسی کو ذریعہ معاش بنایا۔ مطبع نولکشور میں اسکولوں، کالجوں کی نصابی کتابوں کی کتابت کرنے والے کاتبوں میں شامل تھے۔ خطِ نستعلیق میں اچھی مہارت حاصل تھی۔

منشی قاسم علی نقاش ماہر خطاط و خوشنویس تھے۔ اس کے ساتھ وہ ایک باکمال مصور اور نقاش بھی تھے۔ خط نستعلیق میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ مطبع نولکشور سے وابستہ تھے۔ کتابت بہت کم کرتے تھے۔ ان کو کتابوں کے خوشنما ٹائیٹل بنانے پر مامور کیا گیا تھا۔ بہت خوبصورت نقش و نگار کتابت کی روشنائی سے سطر پر بناتے تھے۔ حسب ضرورت پتھر (ل) پر بھی ٹائیٹل کا ڈیزائن بنا دیتے تھے جو خط معکوس میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ تصاویر بنانے میں ان کو خداداد ملکہ حاصل تھا۔ اس زمانے میں تصویر سازی و فوٹو گرافی کی صنعت ابتدائی منزل میں تھی۔ اور کیمرے سے فوٹو بنوانا بہت گراں ہوتا تھا۔ اس لئے ہاتھ سے تصویریں بنانے کا رواج تھا۔ مطبع نولکشور میں ابتدا ہی سے ایسے ماہر خوشنویس وابستہ ہو گئے تھے جو مصوری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان میں قاسم علی کو ایک نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ منشی شمس الدین اعجاز رقم کی لکھی ہوئی گلستان با تصویر کی سب تصویریں قاسم علی نے بڑی چابکدستی سے بنائی ہیں۔ یہ تصاویر اس زمانے میں تو معمولی اور مضحکہ خیز نظر آتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اس دور کی وضع قطع اور لباس و ماحول کی پوری عکاسی کرتی ہیں۔ قاسم علی لکھنؤ کے ماہر نقاش و مصور تھے۔ مولانا عبدالعلی آسی مدراسی نے گلستان کی تقریظ میں ان کے کمالِ فن کی تعریف کی ہے گلستان کے علاوہ متعدد دوسری کتابوں میں بھی ان کی بنائی ہوئی تصاویر موجود ہیں۔

منشی کالکاپرشاد لکھنؤ کے مشہور خطّاط اور خوشنویس تھے۔ خط نستعلیق میں بہت مہارت حاصل تھی۔ فن کے قواعد وضوابط پر گہری نظر تھی، نہایت زود نویس تھے۔ مطبع نولکشور کے ممتاز کاتبوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کا انداز تحریر بہت دلکش تھا۔ انہوں نے طویل عرصے تک مطبع میں ملازمت کی اور پچاسوں کتابیں لکھی ہیں۔ اردو، فارسی کے علاوہ دیوناگری رسم الخط میں بھی کتابت کرتے تھے۔ خط بہت پختہ تھا۔[1]

منشی گوبند پرشاد فضا لکھنؤ کے ماہر خطّاط اور خوشنویس تھے۔ مطبع نولکشور سے وابستہ خوشنویسوں اور کاتبوں میں ان کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ ان کو شعر و شاعری کا اچھا ذوق تھا۔ اچھے شاعر اور سخن فہم تھے، شاعری میں زآر لکھنوی سے شرف تلمّذ حاصل تھا۔ فضا تخلص رکھا۔ ان کو سب سے زیادہ دلچسپی خوشنویسی اور کتابت سے تھی۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے ایک معزّز کائستھ خاندان سے تھا۔ جس میں علم وادب اور شعر و شاعری کا ذوق و شوق عام تھا۔ خطّاطی اور خوشنویسی کی تحصیل، تعلیم کا ایک اہم جز سمجھا جاتا تھا۔ فضا نے اس ماحول میں ہوش سنبھالا تھا۔ ان کو خط نستعلیق میں مہارت حاصل تھی۔ وہ طویل عرصے تک مطبع نولکشور میں بحیثیت کاپی نویس ملازم رہے، انہوں نے اردو، فارسی اور ہندی کی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مطبع نولکشور سے مثنوی مولانا روم کا جو پہلا ایڈیشن شائع ہوا، اس کے آخری تین دفتر فضا نے لکھے تھے جو نہایت خوشخط اور دلکش ہے۔ فسانۂ عجائب کی کتابت پہلی بار انہوں نے کی۔ منشی نولکشور نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

> "منشی گوبند پرشاد صاحب، فضا تخلص، شاعر، سخن فہم، شاگرد زآر مرحوم"، خوشنویس بے بدل، نہایت شیریں مواد، مثنوی مولانا روم کے اخیر کے تین دفتر منشی گوبند پرشاد صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔[2]

مذکورہ تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ فضا [illegible] اور تجربہ کار تھے۔ ممکن ہے کہ وہ ۱۸۵۰ء سے

---

[1] تحقیقاتِ ماہر صفحہ ۱۲ مرتبہ حکیم محمود خاں ماہر

[2] رپورٹ کارگزاری مطبع مرتبہ منشی نولکشور، مطبوعہ اودھ اخبار مورخہ ۹ جنوری ۱۸۷۲ء۔

پہلے لکھنؤ کے کسی مطبع سے منسلک رہے ہوں گے، اور ان کو منشی نولکشور نے تجربہ کار ماہر فن ہونے کے باعث اپنے مطبع میں کام کرنے کے لئے خاص طور پر آمادہ کیا ہو۔ فضا کے اور حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ان کی مثنوی گلزارِ فضا اور دیوان مطبع نولکشور سے شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے علم و عروض پر ایک کتاب لکھی تھی۔[1]

مولوی محبوب احمد

ان کا شمار بہترین خوشنویسوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ ایسے فنکار تھے جن کو کتابت کے علاوہ مصلح سنگ کی حیثیت سے بھی امتیاز حاصل تھا۔ پتھر پر لکھی ہوئی تحریر کی غلطیوں کو اس صفائی سے درست کرتے تھے کہ کاتب کی تحریر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ ان کو خطِ نستعلیق میں مہارت حاصل تھی، خوشنویسی کے اصول و ضوابط کے علاوہ اس کے رموز و نکات پر عبور حاصل تھا۔ ان خوبیوں کے ساتھ ان میں انتظامی صلاحیت بھی بہت تھی۔ جس کی بنا پر وہ لیتھوگرافی سیکشن میں منیجر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے مزاج میں تیزی طراری بہت تھی۔ جہاں کوئی بات خلاف مزاج ہوئی بگڑ جاتے تھے۔ منشی نولکشور کو ان کی مہارتِ فن اور حسن انتظام کا اعتراف تھا۔ لیکن ان کی تنگ مزاجی اور غصے کے جو واقعات دوسرے کارکنوں کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان سے کبھی کبھی الجھن محسوس کرتے تھے۔ منشی نولکشور نے ۱۸۷۲ء کی سالانہ روداد میں دیگر کارکنوں کے ساتھ مولوی محبوب احمد کے متعلق لکھا ہے:

> "مولوی محبوب احمد صاحب، حلقۂ اوّل لیتھوگرافک کارخانے کے افسر" کسی قدر نازک مزاجی سے گاہ گاہ اینٹھ جاتے ہیں بہرحال یہ قصور نوجوانی ہے۔ مگر مطبع کے دلی خیرخواہ ہیں۔ خوشنویسی اور اصلاحِ سنگ میں بھی مہارت، مزاج میں جودت۔ انتظام میں چست و چالاک ہیں۔[2]

مولوی محبوب احمد، عربی و فارسی کی تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ خوشنویسی کا ذوق ابتدا سے تھا۔ منشی شمس الدین کے ہم عصر تھے۔ ممکن ہے ان کے شاگرد ہوں یا مولوی ہادی علی

---

[1] بیسویں صدی کے لکھنوی ادیب مصنف جعفر حسین مطبوعہ اردو اکیڈمی اتر پردیش لکھنؤ۔

[2] اودھ اخبار شمارہ ۹ جنوری ۱۸۷۲ء صفحہ ۲۵

کے شاگرد رہے ہوں کیونکہ اس زمانے میں انہیں دو فنکاروں کا سکّہ استادی جاری تھا۔ مزید حالات نہ معلوم ہو سکے۔

لالہ مکھن لال لکھنؤ کے رہنے والے اچھے خطاط اور کاتب تھے۔ خط نستعلیق بہت اچھا تھا۔ مطبع نولکشور میں ملازم تھے۔ وہ خاص طور پر مطبع کی فہرست کتب لکھنے پر مامور تھے جس کے لکھنے کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا کیونکہ چھوٹی بڑی کئی قسم کی فہرستیں تیار کی جاتی تھیں۔ کتابوں کی کمی و بیشی کے ساتھ ان میں ردوبدل بھی ہوتا رہتا تھا۔ مطبع کے رجسٹر احکامات بابت سنہ ۱۸۸۹-۹۰ء میں کتابت مولوی اسمٰعیل کی ایک تحریر موجود ہے کہ لالہ مکھن لال فہرست نگار علیل ہو گئے ہیں اس لئے حاضر نہیں ہوئے[1] وہ ہندی میں بھی اچھی کتابت کر لیتے تھے۔ مذکورہ رجسٹر میں منشی نولکشور نے لکھا ہے کہ اگر فہرست کی کتابت مکھن لال کریں تو اچھا ہے۔ ان کا ذکر مختلف رجسٹروں اور کتابوں کے آخر میں موجود ہے، لیکن حالات زندگی دستیاب نہ ہو سکے۔

منشی محمد مرزا جان محمود عہدِ نولکشور کے ماہر خطاط، خوشنویس اور نہایت تجربہ کار کاتب تھے۔ شاعری کا ذوق بھی تھا۔ محمود تخلص کرتے تھے۔ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تعلق تھا۔ نہایت محنت سے کام کرتے تھے۔ ان کے متعلق خود منشی نولکشور نے سنہ ۱۸۷۰ء کو مطبع کی سالانہ روداد میں لکھا ہے کہ

"منشی محمد مرزا جان۔ محمود تخلص۔ یہ صاحب نہایت عمدہ خوشنویس اور شاعر بھی ہیں" وہ خاندانی شخص ہیں جن کی بہ نسبت مالک مطبع اپنی رپورٹ میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ صاحب البتہ قابل تحسین اور شکر گزاری مطبع کے ہیں۔ رات دن جس وقت طلب کیا گیا مطبع کے کام پر حاضر ہوئے۔ مالک کارخانہ کے دل میں ان کی محبت ہے۔ اور جس قدر ان کی تحریک کا مطبع کو لحاظ ہوتا ہے بہت کم اور صاحبوں کا لحاظ ہوتا ہے کیونکہ تحریک منشی محمد مرزا جان صاحب لائق تعریف ہے[2]

مرزا جان محمود طویل عرصے تک مطبع نولکشور سے وابستہ رہے اور بچاسوں مضامین اودھ اخبار اور کتابیں لکھیں۔

---

[1] رجسٹر احکامات مالک مطبع نولکشور بابت سنہ ۱۸۸۹-۹۰ء۔ [2] اودھ اخبار مطبوعہ ۹ جنوری سنہ ۱۸۷۲ء۔

(منشی) مہتاب رائے عاصی

عاصی نہایت اچھے خوشنویس تھے۔ ان کا شمار ماہر خطاطوں میں ہوتا ہے۔ اچھے تعلیم یافتہ تھے۔ فارسی کی اچھی استعداد تھی۔ شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ لکھنؤ کی علمی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ مطبع نولکشور سے وابستہ رہے۔ اودھ اخبار کی کتابت کرتے تھے، ساتھ ہی حسب ضرورت مطبع کی کتابیں بھی لکھتے تھے۔ بہت عرصے تک مطبع نولکشور میں کام کرتے رہے۔ وہ لکھنؤ کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور شہر کے اس علاقے میں سکونت تھی جہاں علم و ادب اور شعر و سخن کا زیادہ چرچا رہتا تھا۔[1]

محمد علی عرف محمد بخش

محمد علی مطبع نولکشور میں کام کرنے والے اچھے خوشنویس اور ماہر فن کاتب تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے ذی علم شخص تھے۔ وہ فن خطاطی کے نکات سے خوب واقف تھے۔ خط نستعلیق میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کی کتابت کی ہوئی کتابیں نہایت دلکش اور دیدہ زیب ہیں۔ منشی انوار حسین تسلیم کی مشہور مثنوی سعدین کی کتابت محمد علی نے کی تھی جس کو ۱۸۸۷ء میں مطبع نولکشور نے شائع کیا تھا۔ انہوں نے مثنوی کے مصنف کے حالات بھی لکھے ہیں اور ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ وہ اچھے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی کتابت کی ہوئی بیسیوں کتابوں میں "تاج المدائح" نستعلیق کا اچھا نمونہ ہے۔[2]

مرزا مصطفیٰ حسین

ماہر فن خطاط اور خوشنویس ہونے کے علاوہ وہ نہایت اچھے مصوّر اور نقاش تھے۔ مطبع نولکشور سے وابستہ فنکاروں میں ان کی حیثیت نمایاں تھی۔ انہوں نے بالواسطہ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی لیکن بلاواسطہ وہ شمس الدین اعجاز رقم کے شاگرد تھے۔ جیسا کہ ان کے بیٹے قیصر مرزا نے بتایا ہے کہ وہ منشی شمس الدین کے لکھے ہوئے جلی قلم پوسٹروں اور بعض دوسری تحریروں کی نقل کیا کرتے تھے۔ جس کی بدولت وہ اچھے خوشنویس بن گئے۔ ایک بار مصطفیٰ حسین کسی کی فرمائش پر ایک پوسٹر خط نستعلیق میں لکھ کر صاحبِ فرمائش کو

---

1. رجسٹر احکامات مالک مطبع بابت ۱۸۸۹ء موجود محافظ خانہ مطبع نولکشور
2. دیباچہ و خاتمہ مثنوی سعدین۔ مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۷ء

دینے جارہے تھے۔ راستے میں محلّہ قاضی باغ ہے، اتفاق سے اعجاز رقم اپنے مکان کے باہر کھڑے تھے، مصطفیٰ حسین ہاتھ میں پوسٹر دبائے سامنے سے نکلے تو انہوں نے روک کر پوچھا یہ کیا ہے، مصطفیٰ حسین نے پوسٹر دکھا دیا، بہت خوش ہوئے اور ایک روپیہ انعام دیا۔ یہ بھی پوچھا تھا کہ اصلاح کس سے لیتے ہو؟ جواب دیا کہ آپ کی تحریروں کی نقل کر کے سیکھا ہے۔ یہ واقعہ قیصر مرزا نے مجھے بتایا جو مصطفیٰ حسن کے بیٹے تھے۔

مصطفیٰ حسن مطبع نولکشور سے وابستہ خوشنویسوں اور مصوروں میں بہت مشہور و مقبول تھے۔ وہ کتابوں کے ٹائٹیل کے ڈیزائن بناتے تھے اور کتابوں کے نام جلی قلم سے لکھنے میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ مطبع نولکشور کی مطبوعہ کتابوں کے سرورق عام طور پر بہت خوشنما اور بیل بوٹوں سے مزین نظر آتے ہیں۔ ان میں مصطفیٰ حسین کے بنائے ہوئے بھی شامل ہیں۔ انہوں نے یکم جنوری ۱۹۵۵ء میں وفات پائی، اس وقت ان کی عمر اسّی سال تھی۔

منشی وزیر محمد مطبع منشی نولکشور کے باکمال خطاط و خوشنویس تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے، ایک ذی علم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے مطبع سے وابستہ رہ کر گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ماہر فن خوشنویس تھے۔ نسخ و نستعلیق دونوں میں مہارت حاصل تھی۔ اودھ اخبار اور مطبع میں عرصہ تک کتابت کرتے رہے۔ بہت محنتی اور ہوشمند تھے، اسی لئے منشی نولکشور نے ان کی حسن کارکردگی اور اچھی علمی استعداد کے پیش نظر ان کو ترقی دے کر بعض انتظامی امور کا ذمہ دار بنایا۔ وہ یکے بعد دیگرے کئی شعبوں کی دیکھ بھال کرتے رہے تاہم اپنے اصل فن سے کبھی تعلق منقطع نہیں کیا۔ مطبع نولکشور کے قدیم دفتری کاغذات میں ان کا ذکر متعدد جگہ نظر آتا ہے۔ بدقسمتی سے ایسے باکمال لوگوں کے حالاتِ زندگی محفوظ نہیں رکھے گئے نہ اب ان کے متعلق معلومات کا کوئی مستند ذریعہ موجود ہے۔

"منشی واجد علی شیریں رقم" لکھنؤ کے مشہور خطاط و خوشنویس تھے۔ ان کا تعلق ایک اچھے علمی خاندان سے تھا۔ اردو اور فارسی کی اعلےٰ تعلیم پائی تھی۔ خوشنویسی کا شوق اوائل عمر سے تھا۔ اس زمانے میں مولوی ہادی علی کے شاگرد رشید، شمس الدین اعجاز رقم کے کمالِ فن کی شہرت عام تھی۔ منشی واجد علی نے ان کی شاگردی اختیار کی اور مشق و مزاولت سے قلیل مدت میں ایک اچھے

خوشنویس اور کاتب بن کر نمایاں ہوئے۔ ہر اچھے کاتب کو مطبع نولکشور میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ واجد علی کو بھی مطبع سے وابستہ ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، کیونکہ وہاں کاتبوں کی کثرت کے باوجود بھی مزید کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ انہوں نے طویل عرصے تک کام کیا اور مطبع کی پچاسوں کتابیں لکھیں، بعض مکمل اور بعض ضخیم کتب کے متفرق اجزاء ان کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ منشی شمس الدین' ان سے خصوصیت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کے مطبوعہ دیوان حافظ کا قطعہ تاریخ واجد علی نے بھی فارسی میں لکھا ہے، جس میں استاد کی مہارت فن کا ذکر اور ان کی تعریف و توصیف کی ہے۔

منشی واجد علی کو شعر و شاعری کا شوق بھی تھا۔ وہ اپنے زمانے کے خوشگو شاعروں میں شمار ہوتے تھے اور لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ تخلص واجد رکھا تھا۔ ایسے ہی اہل ذوق کارکنوں کی کوششوں اور مالک مطبع کی ذاتی دلچسپی کے پیش نظر مطبع نولکشور میں ہی بزم مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا کرتا تھا اور آخرکار مشاعرہ کا کلام "گلدستے" کے نام سے شائع ہوتا تھا[1]

منشی ہادی علی اشک

اشک بلند پایہ خوشنویس اور خطاط تھے۔ ان کا شمار اس فن کے ممتاز اساتذہ میں کیا جاتا ہے۔ مرزا غالب جیسے فن شناس ان کے مداح اور قدردان تھے۔ اشک کو خطِ نسخ اور نستعلیق دونوں میں یکساں مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے قرآن شریف کی کتابت خطِ جلی اور خفی دونوں میں کی ہے۔ ایک قرآن شریف بہت جلی لکھا جو چوب قلم کہلاتا ہے' اس میں خطِ نستعلیق میں اردو اور فارسی ترجمہ اور حاشیہ پر تفسیری مطالب بھی ہیں۔ ایسا جلی قلم قرآن شریف شاید و باید ہی کسی کاتب نے طباعت کے لئے لکھا ہو۔ اشک کی ولادت قصبہ بجنور میں ہوئی جو نواح لکھنؤ میں صدیقی شیخ زادوں کی قدیم بستی ہے۔ ان کے والد کا نام حسین علی اور دادا کا نام مجیب الدین ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ان کی ولادت شہر لکھنؤ میں ہوئی۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ سنِ شعور کو پہنچے تو علوم متداولہ کی تحصیل میں مصروف ہوئے۔ عربی و فارسی میں مہارت حاصل کی۔

---

[1] مطبع نولکشور میں اکثر طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ جن میں اس زمانے کے بڑے بڑے اساتذہ فن بھی شرکت کرتے تھے۔ طرحی مشاعروں میں شاعروں کی تخلیقی قوت کی آزمائش ہو جاتی ہے اور زبان و ادب کو ترقی ہوتی ہے۔

مذہبی نصاب تعلیم کی تکمیل کی۔ مکتبی تعلیم کے زمانے سے خوشنویسی کا شوق پیدا ہوا خوش قسمتی سے اس فن کے مشہور استاد حافظ ابراہیم لکھنؤ میں موجود تھے۔ ان کی شاگردی اختیار کی اور مسلسل محنت اور لگن سے خود اس فن کے اساتذہ میں شمار ہونے لگے۔ لکھنؤ جیسے مرکز علم و ہنر اور گہوارہ شعر و سخن میں رہنے کے باعث شعر و شاعری کا ذوق و شوق پروان چڑھا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے لگے۔ شاعری میں نواب فتح الدولہ برق کی شاگردی اختیار کی جو اس دور کے نہایت خوشگو شاعر تھے۔ ان کے ساتھ گہرے روابط قائم ہوگئے۔ برق ۱۸۵۶ء میں جب کلکتہ گئے تو اشک کو بھی ساتھ لے گئے۔ جہاں انہوں نے کچھ عرصہ مٹیا برج میں قیام کیا جہاں اودھ کے معزول حکمران واجد علی شاہ نظر بند کئے گئے تھے۔

جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کم ہوئے تو اشک لکھنؤ واپس آئے اور مطبع محمدی لکھنؤ میں ملازمت کرلی۔ جہاں وہ کتابت کرنے لگے۔ ۱۸۵۸ء میں جب منشی نولکشور نے اودھ اخبار جاری کیا تو ان کو اچھے کاتبوں، خوشنویسوں اور مضمون نگاروں کی تلاش ہوئی۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے اشک کی علمی لیاقت اور خطاطی میں مہارت کی شہرت سنی۔ وہ بڑے مردم شناس شخص تھے۔ انہوں نے اشک کو اپنے مطبع میں کام کرنے کے لئے رضامند کرلیا۔ اور اودھ اخبار کی ادارت ان کے سپرد کی۔ اشک کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ اودھ اخبار کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ ادارت کے ساتھ ساتھ کچھ وقت کتابت کرنے میں صرف کرتے تھے۔ جب منشی نولکشور کو یہ احساس ہوا کہ اشک جیسے جوہر قابل سے وہ کام لینا چاہئے جس میں ان کو مہارت حاصل ہے۔ اس لئے ان کو قرآن شریف کی کتابت اور صحت کتب پر مامور کیا۔ اشک نے طباعت کے لئے چھوٹی بڑی تقطیع پر کئی قرآن شریف لکھے جو ہزاروں کی تعداد میں طبع ہوکر شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ عربی اور فارسی کی متعدد کتابیں لکھیں۔ کلیات نظم غالب فارسی کی کتابت اور صحت کا کام انہوں نے انجام دیا۔ یہ کلیات ۱۸۶۲ء میں دہلی جاکر مرزا غالب سے اشاعت کے لئے حاصل کیا تھا۔ اسی سلسلہ میں

---

۱ تذکرہ سخن شعرا از نساخ، مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔

۲ تذکرہ علمائے ہند رحمٰن علی مطبوعہ نولکشور پریس

۳ مولانا شرر نے لکھا ہے کہ ہادی علی کے استاد کاپی کے ایک خوشنویس میر اکبر علی تھے۔ گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۷۶۔

منشی نولکشور اور غالب میں دوستانہ مراسم قائم ہوگئے تھے۔ کلیات کی کتابت کے دوران اشک بیمار ہوگئے تھے اور کتابت کا سلسلہ کچھ عرصہ بند رہا تو غالب نے قدر بلگرامی کو خط لکھ کر اشک کی صحت کا حال دریافت کیا۔ ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھا کہ:

> کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو! ۶۰ صفحات چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہوگئے۔ کاپی نگار رخصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھئے چھاپہ کب شروع ہو۔[1]

قدر بلگرامی کو لکھا تھا کہ:

> کلیات کے انطباع کی تاریخ میں کیوں لکھوں، اہل مطبع کو خدا منشی صاحب (نولکشور) کے طوقت میں سلامت رکھے کہہ لیں گے۔ چھاپا ۱۲۷۸ء ہجری میں شروع ہوا۔ ۱۲۷۹ء ہجری میں تمام ہوگا۔ مولوی ہادی علی صاحب کے مطبع میں آنے کا حال تم لکھو اور کلیات کے کاپی نگار کے آنے کا حال بھی معلوم کر کے لکھو۔[2]

غالب کے دونوں خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیات کی کتابت کوئی اور کاتب کے سپرد تھی اور ہادی علی کو صحتِ کتابت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی کتابت ہادی علی نے کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ خرابی صحت کی بنا پر کسی دوسرے اچھے کاتب سے بھی مدد لی ہو اگر ایسا نہ ہوتا تو صرف صحت کتابت کے لئے طباعت میں تاخیر نہ ہوتی۔ کیونکہ صحت کتابت کے لئے قدر بلگرامی اور کئی دوسرے فارسی داں عالم مطبع میں موجود تھے اور بہتر طریقہ پر یہ کام کر سکتے تھے۔

اشک کو فن تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ مولوی رحمٰن علی مصنف تذکرہ علمائے ہند، علمی کاموں میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔ منشی نولکشور ان کا بے حد احترام کرتے۔ اس عہد کے اکثر خوشنویس اشک کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ اشک کی فنی مہارت کا ایک دلچسپ واقعہ مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے جو یہاں نقل کرنا مناسب ہے" لکھتے ہیں کہ:

---

1. اردوئے معلّیٰ مطبوعہ ۱۸۶۹ء صفحہ ۱۴۳ مکتوب ۱۵ مئی ۱۸۶۲ء بنام میر مہدی مجروح
2. خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد، مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ (اس پر مالک رام کا نام درج ہے جو غلط ہے)

منشی حامد علی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر منشی ہادی علی منشی یکجی! جنہوں نے طبع ہونے کے لئے لکھنؤ میں پہلا قرآن شریف لکھا تھا۔ نسخ کے بڑے استاد تھے، منشی عبدالحیّ سندیلوی، اور میر بندہ علی مرتعش ایک صحبت میں جمع تھے۔ یہ نسخ کے تمام باکمالوں کی صحبت تھی۔ کسی نے ایک قطعہ نسخ فروخت کے لئے لاکے پیش کیا گو اس میں کاتب کا نام نہیں لکھا تھا، مگر ان باکمالوں نے بالاتفاق پہچان لیا کہ خاص یاقوت کے ہاتھ کا ہے اور سب کو شوق ہوا کہ اس کو اپنے قبضہ میں کریں۔ مگر منشی ہادی علی صاحب نے کہا یہ ایک دن میرے پاس رہے تو مجھے غور کرنے کے بعد اطمینان ہوگا کہ دراصل یہ یاقوت کے ہاتھ کا ہے یا نہیں۔ مالک نے دیدیا، اور وہ اسے گھر لے آئے۔ دوسرے دن لے جاکے پیش کیا اور کہا "واقعی یہ یاقوت کے ہاتھ کا ہے۔ اسی کے ساتھ کا یاقوت کا ایک قطعہ میرے پاس بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے لے جاکے اس سے ملایا تو بعینہٖ وہی پایا، اور مجھے یقین آگیا کہ واقعی یہ یاقوت کا ہے" اور دونوں قطعے سب کے سامنے رکھ دیے۔ سب نے بلا تامّل تسلیم کر لیا کہ دونوں یاقوت ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ مگر میر بندہ علی مرتعش نے منشی ہادی علی والے قطعے کو غور سے دیکھا، پھر مسکرائے اور اس کے نیچے لکھ دیا ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

یہ تحریر لکھ کر منشی عبدالحیّ صاحب بگڑ گئے اور کہا، آپ کو اس میں شک ہے؟ میر بندہ علی نے کہا، یہ قطعہ تو یاقوت کے ہاتھ کا نہیں ہو سکتا۔ منشی عبدالحیّ اور دیگر حریفانِ صحبت نے دعویٰ کیا کہ یہ خاص یاقوت کے ہاتھ کا ہے۔ میر بندہ علی نے اس میں ایک واؤ کا سرا دکھایا اور کہا کہ "یہ یاقوت کا نہیں ہو سکتا" اب سب گو مگو میں پڑے ہوئے تھے کہ منشی ہادی علی نے اس وصلی کا ایک کونا پھاڑ کے کاغذ کی تہہ کے اندر سے نکال کے اپنا نام دکھا دیا، اور سب کو یقین آگیا کہ یہ کارستانی منشی ہادی

علی صاحب کی تھی۔ سب نے ان کی بے حد تعریف کی اور انہوں نے کہا کہ
میں تو بندہ علی صاحب کی نظر کا قائل ہو گیا[۱]

اشک زندگی کے آخر زمانے تک مطبع منشی نولکشور سے وابستہ رہے۔ انہوں نے طویل علالت کے بعد ۲۱ رمضان المبارک ۱۲۸۱ھ ہجری مطابق ۱۸۶۵ء کو بمقام لکھنؤ وفات پائی[۲]۔ ان کو اپنے آبائی وطن قصبہ بجنور کے خاندانی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ان کی وفات پر کئی شاعروں نے قطعات تاریخ لکھے جو اودھ اخبار اور دیگر اخبارات میں شائع ہوئے۔ مرزا غالب کے مشہور شاگرد مرزا تفتہ نے بھی قطعہ تاریخ کہا تھا جو درج ذیل ہے۔

مولوی ہادی علی اشک از جہاں رفت و مرا
بیش در سینہ جا گیرد و غمش در دل خیزد
بس جز این چہ تاریخش نو سیم و تفتہ من
رحلتِ ہادی علی اشک از جہاں ماتم کرد

۱۲۸۱ھ ہجری

اشک خوش گو شاعر تھے۔ لیکن یہاں ان کا تعارف بحیثیت خوشنویس مقصود تھا۔ اس لئے شاعری پر اظہار خیال اور نمونہ کلام پیش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔

اشک کے تلامذہ اشک کے تلامذہ کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ سب کے حالات تو درکنار ان کے معلوم کرنا بھی ممکن نہیں۔ ان کے ارشد تلامذہ میں سب سے زیادہ مشہور اور باکمال شخصیت منشی شمس الدین اعجاز رقم کی تھی جنہوں نے استاد سے زیادہ شہرت حاصل کی خود ان کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے جن میں کئی بڑے باکمال خوشنویس تھے اور آج بھی ان کا فیض جاری ہے۔ لکھنؤ اور بیرون لکھنؤ اس زمانے میں جو ممتاز خوشنویس کتابت میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں بالواسطہ اور بلاواسطہ اکثریت اسی سلسلہ کی ہے۔

اشک کے لکھے ہوئے حسب ذیل قرآن شریف ہزاروں کی تعداد میں کئی بار

۱۔ گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۷۲ و ۱۷۳۔ مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۲۔ خمخانۂ جاوید، حالات اشک۔

طبع ہوئے اور سارے ملک کے علاوہ، افغانستان، ایران، چینی ترکستان میں بہت مقبول ہوئے۔

۱۔ قرآن مجید چوب قلم، پانچ سال میں لکھا تھا۔ اس میں ایک ترجمہ اردو اور ایک فارسی میں تھا۔ دونوں خطِ نستعلیق میں ہیں اور حاشیہ پر تفسیری مطالب ہیں۔

۲۔ قرآن شریف بخط جلی اوسط۔ نہایت خوشخط۔

منشی ہیرالال لکھنؤ کے نہایت اچھے خوشنویس تھے۔ خطِ نستعلیق اور خطِ شکستہ خوب لکھتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت لکھنؤ کے مخصوص ماحول میں ہوئی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اچھی استعداد تھی۔ خوشنویسی کا شوق اور کتابت کو ذریعہ معاش بنانے کا خیال اپنے ہم عصر کاتبوں کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ منشی شمس الدین اعجاز رقم کی شاگردی اختیار کی۔ اور ان کی نگرانی میں رہ کر کتابت کرتے رہے۔ انہوں نے اودھ اخبار بھی لکھا اور چھوٹی بڑی کئی کتابیں لکھیں۔ وہ عرصہ دراز تک مطبع نولکشور سے وابستہ رہے۔ اپنے استاد اعجاز رقم کے ہم عصر تھے۔ مطبع نولکشور کی بعض مطبوعہ کتب کے آخر میں ان کا نام نظر آتا ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ ان کے مفصل حالات نہ معلوم ہو سکے۔

لکھنؤ کے چند ممتاز اور ماہر فن خطّاط عہد حاضر میں

شیخ تاج الدین عشرت بیسویں صدی کے باکمال خطّاط، بلند پایہ خوشنویس، آرائشی خوشنویسی کے ماہر فنکار۔ قدرت نے ان کی فطرت میں یہ فنِ لطیف ودیعت کیا تھا۔ انہوں نے خوشنویسی کی تقریباً تمام اصناف میں ایسے نادر شاہکار پیش کئے ہیں جن کی مثال مشکل سے ملے گی۔ یہ سب کچھ اپنے ذاتی ذوق و شوق کی تسکین کے لئے کیا۔ صلہ و ستائش سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ نام و نمود کی خواہش سے بے نیازی ان کی طبیعت ثانیہ تھی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ انجینئر تھے۔ انھوں نے کاپی نویسی (کتابت) سے کبھی دلچسپی نہیں لی۔

تاج الدین عشرت ۱۸۹۳ء کو اپنے ننہال قصبہ دیوی شریف (ضلع بارہ بنکی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد شیخ سراج الدین کا تعلق قصبہ بجنور ضلع لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ وہ فرخ آباد میں پولیس انسپکٹر تھے۔ عشرت کی تعلیم و تربیت ان کے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ کم سنی کے زمانے میں ان کو لکھنے اور پھول پتے بنانے کا شوق تھا۔ کھیل کود کے بجائے کاغذ کے ٹکڑوں پر گود گاد کرتے رہتے تھے۔ تحصیل علم کا بہت شوق تھا۔ اردو فارسی کی تعلیم ایک مقامی استاد سے حاصل کی۔ گلستان، بوستان پڑھنے کے بعد ایک اسکول میں داخلہ لیا، ہائی اسکول کرکے گوالیار کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا، تین سال بعد انجینئرنگ کا امتحان پاس کر لیا، اور ریاست گوالیار میں ملازمت مل گئی۔ انکی شادی دیوی شریف کے ایک ذی عزت خاندان میں ہوئی جس کا تعلق مشہور بزرگ ـــ حاجی وارث علی شاہ سے ہے۔ عشرت مرحوم نے ۱۲ سال کی عمر سے خوشنویسی کی طرف زیادہ توجہ کی۔ انہوں نے گوالیار میں میر عابد علی کی شاگردی اختیار کی جو باکمال خوشنویس اور مہاراجہ کے درباری خریطہ نگار تھے۔ عشرت مرحوم نے ان کی رہنمائی میں فن خطاطی کے اصول و ضوابط اور رموز و نکات ذہن نشین کئے، اور مشق کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ اپنے ذوق تحریر کے

باعث ابتدا ہی سے اپنے استاد کے ارشد تلامذہ میں ممتاز ہو گئے۔ استاد کو بھی ان پر فخر تھا۔ دوران ملازمت بھی انہوں نے یہ شغل جاری رکھا۔ جب بھی فرائضِ منصبی سے فرصت ملتی وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اس فن میں طرح طرح کی اختراعات کیں۔ اور اس فن کو اتنی ترقی پہ پہنچایا جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ نام نمود سے بے پرواہ ہو کر کیا۔ نہ کبھی صلہ و ستائش کے لئے وہ طریقے اختیار کئے جو بڑے بڑے فنکاروں کی عادت ہے۔

۱۔ تاج الدین عشرت نے خط طغرا کو عروج پر پہنچایا۔ پرانے اساتذہ فن نے اس خط میں چند اشعار، کچھ آیاتِ قرآن اور بعض فقرات خطِ طغرا میں لکھے ہیں جو بعض عمارتوں اور خوشنویسی کی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن عشرتؔ نے مثنوی مولانا روم کے ڈھائی سو منتخب اشعار خطِ طغرا میں لکھے ہیں جن کو دیکھ کر ماہرفن حیرت زدہ ہو گئے۔ ڈھائی سو وصلیوں میں اتنی ہی قسم کی بسم اللہ لکھی ہے۔

۲۔ انہوں نے خط غبار کو بھی ترقی دی اور اس میں بھی جدتیں کی ہیں۔ اسی طرح خط ماہی میں اعلےٰ نمونے پیش کئے۔ یہ سب بخط نستعلیق ہیں۔

۳۔ ان کو خطِ نستعلیق جلی، اور نسخ جلی میں کمال حاصل تھا۔ انہیں میں طرح طرح کے تجربات کیے۔ اس کے علاوہ خط شکستہ کے بڑے ماہر تھے، انہوں نے کئی طرح سے شکستہ تحریریں لکھی ہیں۔ وہ قلم برداشتہ جو کچھ لکھتے نہایت دلکش نظر آتا۔ ان کی ہر تحریر میں ندرت تھی۔

۴۔ عشرت نے رباعیات عمر خیام خط نستعلیق جلی میں لکھی ہیں جن کی تعداد ۳ سو ہے۔ ہر رباعی کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تحریر ہے۔ لیکن سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ انہوں نے زندگی بھر کوئی تفریحی مشغلہ اختیار نہیں کیا بلکہ اپنا سارا وقت خوشنویسی میں صرف کرتے تھے۔ گوالیار اسٹیٹ کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے لکھنؤ میں مستقل قیام اختیار کیا اور اپنا مشغلہ جاری رکھا۔ جہاں شمس الدین اعجاز رقم کے شاگرد منشی محمد افضل اور مشہور ماہر خطاطی ممتاز حسین جونپوری، ان کی تحریروں کو دیکھنے کے لئے ان کے پاس آتے رہتے تھے۔ سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے مثنوی مولانا روم کے طغروں کا حال سنا تو وہ خاص طور

پھر ان کو دیکھنے عشرت مرحوم کے مکان پر گئے۔ ۱۹۵۴ء میں جب شاہ ایران، محمد رضا پہلوی لکھنؤ آئے تو ان کو ایک علمی ادارے کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا گیا جو عشرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، شاہ نے ان کی خوشنویسی سے خوش ہو کر ایک مناسب عطیہ ان کے مکان پر بھیجا کیونکہ عشرت خود حاضر نہ ہو سکے تھے۔ انہوں نے اپنا گرانقدر ذخیرہ خوشنویسی فروخت کرنا اپنی زندگی میں پسند نہ کیا۔[1] البتہ اپنے اعزّا و احباب کو تحفہ کے طور پر قطعات و کتبات دے دیتے تھے۔ عشرت کو شعر و شاعری کا ذوق و شوق بچپن سے تھا۔ انہوں نے گوالیار میں مضطر خیر آبادی سے اصلاح لی اور وہ ان کی شعر گوئی اور سخن فہمی سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کے فیضانِ صحبت نے شاعری کا رنگ پختہ کر دیا۔ راجستھان اور لکھنؤ میں ان کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے۔ اکثر وہ اپنے آبائی وطن قصبہ خوشگڈھ (متصل قصبہ امیٹھی بندگی میاں) میں قیام کرتے تھے جہاں ۱۹۴۷ء سے قبل ان کی نگرانی میں انجمن گلستان ادب کا قیام عمل میں آیا تھا جس نے شعر و ادب کی غیر معمولی خدمات انجام دیں۔

تاج الدین عشرت کے چھوٹے بھائی دباج الدین صدیقی نے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کامیاب کوشش کی مگر سرکاری ملازمت کی مشغولیت نے ان کو اس فن میں ترقی سے محروم رکھا۔ عشرت نے ۱۹۵۹ء میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ ان کی اولاد میں چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ بد قسمتی سے کسی لڑکے نے ان کے فن کو نہیں اپنایا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا فن وہبی ہے اکتسابی نہیں۔

سید ابوطاہر زیدی

لکھنؤ کے ماہرِ فن خطاط و خوشنویس تھے۔ ان کا تعلق ایک معزز اور ذی علم خاندان سے ہے۔ ماہ جنوری ۱۹۰۵ء کو بمقام لکھنؤ ولادت ہوئی۔ وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ بچپن سے خوشنویسی کا شوق تھا۔ ممتاز خطاط مرزا محمد جواد کی شاگردی اختیار کی جو اعجاز رقم کے شاگرد رشید تھے۔ اس حیثیت سے وہ بھی اعجاز رقم کے سلسلۂ تلامذہ سے منسلک ہوتے۔ ابوطاہر مرحوم کو خط نستعلیق میں مہارت حاصل تھی، نسخ بھی اچھا لکھتے تھے۔ لیکن ان کا بیشتر سرمایہ کتابت نستعلیق میں ہے۔ انہوں نے ابتداء ہی سے کتابت کو ذریعۂ معاش بنایا۔

---

[1] عشرت مرحوم کا سارا سرمایہ تحریر ان کے بڑے بیٹے فرید الدین کی تحویل میں تاحال محفوظ ہے۔

مولانا عبدالحلیم شررؔ کے رسالہ "دلگداز" کی کتابت کرتے تھے۔ یہ رسالہ شررؔ نے مطبع نولکشور سے علیحٰدہ ہونے کے بعد جاری کیا تھا۔ اس زمانے میں لکھنؤ کے تقریباً نوے فیصد کاتب کسی نہ کسی طور سے مطبع نولکشور کا کام ضرور کرتے تھے۔ ابوطاہر مرحوم کے متعلق تصدیق تو نہیں لیکن قیاس کہتا ہے کہ انہوں نے بھی کچھ کتابیں لکھی ہوں گی۔

۱۹۲۴ء میں زیدی مرحوم لکھنؤ سے آگرہ چلے گئے جہاں ایک پریس میں ان کو ملازمت کی پیش کش کی گئی تھی۔ آگرہ کے دوران قیام ان کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ۴۲-۱۹۴۶ء کلکتہ میں قیام رہا جہاں مشہور مؤرخ ڈاکٹر مہدی حسن کی تصانیف کی کتابت کرتے رہے۔ ڈاکٹر موصوف ان کے بڑے قدردان تھے اور ان کی تحریر کو بہت پسند کرتے تھے۔ کچھ عرصہ ہفتہ وار "ضرب کلیم" سے وابستہ رہے۔

عمر کے درمیانی دور میں ان کی تحریر میں بہت پختگی اور دلکشی پیدا ہوگئی تھی اور ان کا شمار ممتاز کاتبوں اور خوشنویسوں میں ہونے لگا۔ ۱۹۴۹ء میں دہلی چلے گئے اور وہاں کے کئی اشاعتی اداروں میں کام کیا۔ ۱۹۶۳ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے ان کو علی گڑھ بلا یا اور انجمن کی کتابوں اور ہماری زبان کی کتابت کا انتظام و اہتمام ان کے سپرد کیا۔ اس خدمت کو انہوں نے بحسن و خوبی انجام دیا۔ ۱۹۷۰ء میں علیل ہو گئے اور جب علالت نے طول کھینچا تو اپنے وطن لکھنؤ چلے گئے جہاں ۲۰ اگست ۱۹۷۱ء کو وفات پائی اور امین الدولہ کی کربلا میں دفن کئے گئے۔ اولاد نرینہ میں دو بیٹے ان کی یادگار ہیں۔ مرحوم کے چھوٹے بیٹے ابوجعفر زیدی اس وقت ہندوستان کے چند منتخب و بلند پایہ خوشنویسوں اور کاتبوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ زیدی مرحوم کی تحریر کا عکس کتاب میں شامل ہے۔

سیّد ابوجعفر زیدی

عہد حاضر کے یگانۂ روزگار خطاط اور خوشنویس۔ وہ ہندوستان کے ان چند ماہر فن نستعلیق نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں جن کی بدولت اس فن کی آبرو قائم ہے۔ ابتدا میں انہوں نے خطاطی کی تعلیم اپنے والد ابوطاہر زیدی مرحوم سے حاصل کی، ان کی خوشنویسی کا ذوق و شوق ورثہ میں ملا تھا، جس کو انہوں نے اپنی خداداد ذہانت اور غیر معمولی ریاضت سے عروج پر پہنچایا۔ ان کی محنت اور اپنے فن سے محبت کی بدولت عہد جوانی میں ہندوستان گیر شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ اردو اور فارسی کے علمی و ادبی حلقوں میں وہ اپنے کمال فن کے باعث

متعارف ہیں۔

زیدی صاحب کی ولادت ۱۹۳۵ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی جہاں کا آبائی وطن ہے۔ ان کے والد سید ابوطاہر لکھنؤ کے مشہور خطاط تھے۔ زیدی صاحب کی تعلیم و تربیت انہیں کی نگرانی میں ہوئی۔ وہ اپنے والد کے ساتھ کچھ عرصہ آگرہ اور علی گڑھ میں رہے۔ یہ زمانہ ان کی تعلیم کا تھا لکھنے کی مشق جاری رہی۔ چودہ، پندرہ سال کی عمر تھی جب وہ اپنے والد کے ساتھ دہلی گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی، اسی زمانے میں کتابت کرنے لگے۔ دہلی کے بعض اخبارات و رسائل سے وابستہ رہے۔ لیکن اپنے خط کو بہتر بنانے کی جدوجہد جاری رکھی، ابتدا میں انہوں نے ماہنامہ شاہراہ دہلی۔ ہفتہ وار ریاست "دہلی" شاعر آگرہ کی کتابت کی۔ بالآخر ۱۹۶۱ء میں ان کے حسن خط سے متاثر ہو کر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے ان کی خدمات حاصل کر لیں، جہاں وہ شعبۂ مذکور میں مرتب کی ہوئی قدیم معیاری کتابوں کے مسودات کی کتابت کرنے کے علاوہ، شعبہ کے ششماہی رسالہ اردوئے معلّیٰ بھی لکھتے رہے۔ شعبۂ اردو کے زیر اہتمام زیدی صاحب کی کتابت کی ہوئی تقریباً چالیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جو فن خوشنویسی کی جملہ صوری و معنوی خوبیوں کی حامل ہیں اور حسن خط کے باعث علمی و ادبی حلقوں میں مقبول ہیں۔ زیدی صاحب نے کسی ادارے میں داخلہ لے کر تعلیم نہیں حاصل کی۔ لیکن اپنے علمی ذوق و شوق سے مطالعہ کتب کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اور فرائض منصبی کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم اور جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کے امتحانات نمایاں طور پر پاس کئے۔ ان کو خط نسخ لکھنے میں بھی مہارت حاصل ہے، حالانکہ انہوں نے نسخ میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ صحیفۂ خوشنویسیاں کے مرتب شاغل جے پوری نے بھی اپنی کتاب میں زیدی صاحب کا ذکر کیا ہے۔

۱۹۸۵ء میں زیدی صاحب کی فنی خدمات کے پیش نظر ایوان غالب نئی دہلی کی طرف سے ان کو پدم چند گپتا غالب انعام و اعزاز سے نوازا گیا۔ ان کی خطاطی کے چند نمونے حالات کے ساتھ شامل ہیں۔ زیدی صاحب تاحال شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں کام کر رہے ہیں۔

ع۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

قاری محمد علیم نسخ اور نستعلیق میں مہارت حاصل ہے۔ صفِ اوّل کے خوشنویسوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ نام محمد علیم اور والد کا نام ضیاء الحق ہے۔ قصبہ تارہ ضلع الہ آباد ان کا آبائی وطن ہے۔ محمد علیم ماہ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد کی نگرانی میں پائی۔ کچھ عرصہ مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد میں تعلیم حاصل کی، اور وہیں مشہور و ممتاز ماہرِ قرأت قاری عبدالرحمٰن مکّی سے فنِ قرأت قرآن کی تحصیل میں مصروف رہے۔ وہ نہایت اچھے قاری کی حیثیت سے نمایاں ہوتے۔ خوشنویسی کا شوق بچپن سے تھا۔ جب وہ ثانوی تعلیم کے لئے لکھنؤ گئے اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں داخلہ لیا، تو خوشنویسی میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ اس زمانے میں منشی شمس الدین اعجاز رقم اس فن کے استاد تھے۔ علیم صاحب نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ اعجاز رقم اس زمانے میں مبتدیوں کو اپنے ماہرِ فن شاگردوں کے سپرد کر دیتے تھے۔ علیم صاحب کو منشی محمد افضل کی شاگردی میں شامل کرا دیا۔ انہیں سے علیم صاحب نے اس فن کی تکمیل کی۔ ان کو خطِ نسخ میں بھی اتنی ہی مہارت ہے جتنی نستعلیق میں۔ ان کی تحریر کا ایک منفرد انداز ہے جس کو پہچانا جاتا ہے۔

قاری علیم نے تعلیم سے فراغت کے بعد خوشنویسی اور کتابت کو بطور پیشہ اپنایا۔ اور اپنی زندگی میں کئی سو بہترین کتابوں کی کتابت کی۔ وصلیاں اور قطعات لکھے۔ انہوں نے ابتداء ہی سے مطبع منشی نولکشور سے رابطہ قائم کیا اور وہاں کی معیاری کتابوں کی کتابت کی۔ ان کے اساتذہ اعجاز رقم اور منشی افضل کا تعلق نولکشور پریس سے تھا اس لئے ان کے شاگردوں کو بھی مطبع میں کام کرنے کے لئے خاص طور پر ترجیح دی جاتی تھی۔ درمیانی دورِ حیات میں قاری علیم نے دوسرے مطابع میں بھی کام کیا لیکن خاص طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء اور نامی پریس سے زیادہ تعلق رہا۔ ۱۹۷۲ء میں اردو اکیڈمی اتر پردیش نے ان کو اپنے خطّاطی کے اسکول کا نگران استاد مقرر کر دیا۔ جہاں انہوں نے کئی سال کام کیا اور ان کی محنت اور توجہ سے کئی سو خوشنویس منظرِ عام پر آئے جو مختلف مطابع اور اداروں میں کام کر رہے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں وہ اس منصب سے سبکدوش ہو گئے اس وقت (دسمبر ۱۹۹۰ء) ان کی عمر ۸۵ سال سے کچھ زیادہ ہے، لیکن لکھنا ترک کر دیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ انہوں نے مطبع نولکشور میں جن کتابوں کی کتابت کی ہے،

ان میں حدیث کی مشہور کتاب مظاہر حق ۔ بوستان مترجم، کریم اللغات مع فرہنگ محاوراتِ فارسی، اشعۃ اللمعات شاہ عبدالحق دہلوی جیسی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی مشہور کتاب سیرت سید احمد شہید اور متعدد دوسری تصانیف انہوں نے لکھی ہیں۔ کچھ عرصہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے شعبہ نشر و اشاعت میں بھی کام کیا ہے۔ وہاں انہوں نے دہلی اردو اخبار جلد اوّل، خدنگ غدر لکھی ہیں۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے، معاصر خوشنویسوں کے علاوہ لکھنؤ اور دہلی کے ممتاز اہل علم ان کا احترام کرتے ہیں۔

قیصر مرزا خوشنویسی اور خطاطی قیصر مرزا کو وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد مرزا مصطفیٰ حسین نہایت اچھے مصوّر اور خوشنویس تھے۔ قیصر مرزا نے ابتدائی تعلیم سلطان المدارس میں حاصل کی، اسی کے ساتھ خوشنویسی اپنے والد سے سیکھی۔ ۱۲ سال کی عمر سے مشق شروع کی، نسخ اور نستعلیق دونوں سے دلچسپی تھی، انہوں نے منشی محمد جوآد کی شاگردی اختیار کی جو خط نسخ میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ قیصر مرزا نے کچھ عرصہ نظامی پریس میں کتابت کا کام کیا۔ یہ پریس ان کے استاد منشی محمد جوآد نے قائم کیا تھا۔ اس کے بعد مطبع منشی نولکشور میں کام کرنے لگے، جہاں ان کے والد ماجد نے عرصے تک اس فن کی خدمت انجام دی تھی۔

قیصر مرزا نے مطبع نولکشور میں ملازمت نہیں کی لیکن مستقل طور پر طویل مدت تک مطبع کے لئے کتابت کرتے رہے۔ ان کا شمار اچھے خوشنویسوں میں کیا جاتا تھا۔ انہوں نے چھوٹی بڑی پچاسوں کتابیں لکھی ہیں جن میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں۔

اکسیر ہدایت ترجمہ کیمائے سعادت امام غزالی ۲ جلد کامل۔ تفسیر قادری ۲ جلد۔ قرابادین اعظم ۲ جلد۔ شریعہ ہاگوت اردو۔ تاریخ ادب اردو، مترجم مرزا محمد عسکری۔ وہ بہت زود نویس ہیں۔

لیکن اس کے باوجود تحریر کی دلکشی اور فنی خوبیوں میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

اس وقت ان کی عمر ۷۰ سال پورے ہو چکے ہیں۔ پیرانہ سالی کے باوجود کچھ نہ کچھ لکھ لیتے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا ہے، جعفر مرزا۔ اس نے اپنے والد سے فن خوشنویسی کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس وقت وہ لکھنؤ کے نوجوان کاتبوں میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ توقع کی جا سکتی

ہے کہ مستقبل قریب میں وہ اپنے فنکار باپ کا اچھا جانشین ثابت ہو۔ قیصر مرزا کی تحریر کا نمونہ اس تذکرے میں موجود ہے۔

سید نجم الحسن

موجودہ زمانے کے ماہر خطاطوں اور خوشنویسوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید نور الحسن ہے۔ نجم الحسن نے شیعہ اسکول لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ خوشنویسی کا شوق طالب علمی کے زمانے سے ہوا۔ انہوں نے سید محمد جواد کی شاگردی اختیار کی۔ نسخ و نستعلیق کے علاوہ خط ثلث بھی اچھا لکھتے ہیں۔ اتفاق سے ان کی شادی محمد جواد کی دختر سے ہوئی۔ اس طرح وہ اپنے استاد کے داماد اور ان کے نظامی پریس کے مالک بھی ہوگئے۔ نجم الحسن کو خط نسخ سے زیادہ دلچسپی بھی ہے۔ انہوں نے قرآن شریف کی نہایت دیدہ زیب کتابت کی جو نظامی پریس میں طبع ہوا اور بہت مقبول ہے۔ خطِ نستعلیق میں بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ بقیدِ حیات ہیں اور نظامی پریس کی دیکھ بھال میں وقت صرف کرتے ہیں۔ کتابت کرنا ضعیف العمری کے باعث ترک کردیا ہے۔ یہ مطبع نولکشور سے وابستہ نہیں رہے لیکن منشی شمس الدین کے شاگردِ رشید مرزا جواد کے شاگرد ہونے کے باعث اسی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

منشی محمد نواب رمّال

مطبع نولکشور سے وابستہ خطاطوں اور خوشنویسوں میں اپنے حسنِ خط کی بدولت بہت مقبول تھے۔ خاص لکھنؤ کے رہنے والے اور ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ خطاطی کا شوق بچپن سے تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ خوشنویسی کی مشق بھی جاری رکھی۔ اور منشی شمس الدین کی شاگردی اختیار کی۔ کم عمری میں ان کے شاگرد ہوگئے تھے۔ خط نستعلیق بہت اچھا تھا۔ نسخ بھی خوب لکھتے تھے۔ یہ عہدِ نولکشور کے بعد مطبع سے وابستہ ہوئے اور سنہ ۱۹۵۰ء تک کام کرتے رہے۔ جب مطبع نولکشور دو وارثوں میں تقسیم ہونے لگا اس وقت دل برداشتہ ہوکر انہوں نے ملازمت ترک کردی اور اس کے کچھ عرصہ بعد وفات پائی۔ محمد نواب کو خوشنویسی کے علاوہ علم رمل میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ لوگ بکثرت ان کے پاس نوشتہ تقدیر معلوم کرنے آتے تھے۔ ان کے والد منشی بہادر حسین بہت ماہر خوشنویس اور مصلح سنگ تھے۔ اور مطبع نولکشور میں ملازم تھے۔

محمد نواب سے مطبع نولکشور سے وابستہ رہ کر کئی بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں. کلیات میر تقی میر ان کی کتابت کا اچھا نمونہ ہے۔ انہوں نے اردو کی نصابی کتابیں اور اردو میں دوسرے مضامین کی کتابیں بکثرت لکھی ہیں. نہایت خوش اخلاق اور محنتی شخص تھے۔ راقم السطور نے ان کو آخری دور میں یعنی ۱۹۴۷ء میں دیکھا ہے۔ جب انہوں نے انوار الادب عربی کے دو حصوں کی کتابت کی تھی اور علم النفس کے ۴ رسالے نہایت خوشخط لکھے تھے. وہ محلہ حیدر گنج میں رہتے تھے. کوشش کے باوجود ان کے کسی عزیز قریب سے ملاقات اب تک نہ ہو سکی، اسی لئے ان کے ذاتی حالات تحقیق کے ساتھ معلوم نہ کر سکا. مولانا عبد الباری آسی اور میر انیس کی رباعیات بھی محمد نواب نے جلی قلم سے لکھی تھیں جو خط نستعلیق کا دلکش نمونہ ہیں. آسی مرحوم ان کے بڑے مدّاح تھے۔ محمد نواب نے نظم پروین کو دوبارہ سپرد کتابت کیا تھا. کیونکہ اعجاز رقم کی جو کتابت پتھر پر چسپیدہ تھی وہ کمزور ہو گئی تھی اس پر متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ اس لئے نئی کتابت کی ضرورت پیش آئی. یہ کام محمد نواب کے سپرد کیا گیا. انہوں نے نہایت محنت سے کتابت کی اور استاد کے خط سے خط ملا دیا. جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ:

> نصف کتاب انہا کی تختیاں وقطعات جو کہ فرسودہ ہو گئی تھیں ان کو مجھ کمترین نے از سر نو کتابت کر کے استاد محترم کے قلم سے حتی الامکان ملا دیا ہے۔ احقر محمد نواب غفر اللہ الوہاب شاگرد رشید حضرت اعجاز رقم [1]

---

[1] نظم پروین صفحہ آخر مطبوعہ ۱۹۵۱ء ستائیسواں ایڈیشن.

کتابیات

۱۔	ہنرمندانِ اودھ	اسرار حسن خاں
۲۔	تحقیقاتِ ماہر	حکیم محمود خاں
۳۔	تذکرہ خوشنویساں	مولوی غلام محمد
۴۔	پیدائش خط و خطاطاں	مرزا عبدالحمید ایرانی
۵۔	صحیفۂ خوشنویساں	احترام الدین شاغل
۶۔	رجسٹر احکامات مطبع نولکشور	بابت ۱۸۸۶ء محافظ خانہ نولکشور پریس
۷۔	رجسٹر احکامات مطبع نولکشور	بابت ۱۸۸۹ء محافظ خانہ نولکشور پریس
۸۔	رجسٹر احکامات مطبع نولکشور	بابت ۱۸۹۰ء محافظ خانہ نولکشور پریس
۹۔	تاریخ سلاطین اودھ	کمال الدین حسینی
۱۰۔	تاریخ اودھ	نجم الغنی رامپوری
۱۱۔	مختصر سوانح منشی نولکشور	امیر حسن نورانی
۱۲۔	جیون چرتر نولکشور	رام جی لال
۱۳۔	تذکرہ کاملانِ رامپور	
۱۴۔	فائل اودھ اخبار ۱۸۷۰ء	خدابخش لائبریری پٹنہ
۱۵۔	فائل اودھ اخبار ۱۸۶۲ء	ایوانِ غالب لائبریری نئی دہلی
۱۶۔	فہرست کتب کلاں مطبع نولکشور	۱۸۹۰ء
۱۷۔	فہرست کتب کلاں مطبع نولکشور	۱۹۰۶ء
۱۸۔	فہرست کتب کلاں مطبع نولکشور	۱۹۱۱ء
۱۹۔	اعجاز رقم	منشی شمس الدین اعجاز رقم
۲۰۔	نظمِ پروین	منشی درگا پرشاد سحر
۲۱۔	ارژنگ چین	منشی درگا پرشاد سحر

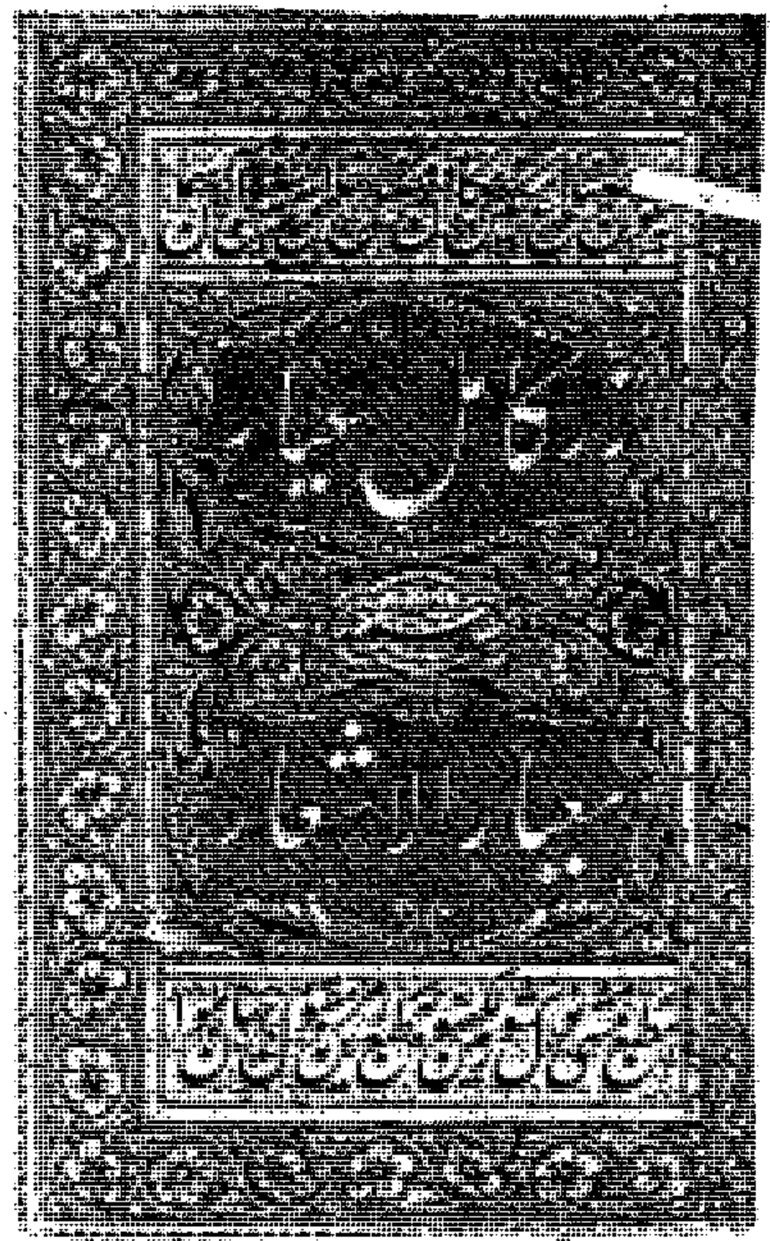

معیار الاشعار مع ترجمہ موسوم بہ زر کامل عیار مطبع لکھنو ۱۹۰۳ء

Rs. 13.00